

The Boy Who Lived !

نسل (نمرہ احمد)

قسط نمبر: 24

”ٹوٹے تارے جیسا دل“

میں نے دیا تمہیں سورج!
مگر چاہا تم نے چاند!
جب چاند دیا تم کو
تم نے مانگے ستارے
تو میں اندھا دھند بچی
لامحد دوستاروں کی کہکشاں میں
اور خود کو لپیٹا
ہر اک ستارے کے گرد
صرف تمہارے لیے
ستارے چاند اور سورج باہم بھی
تمہارے قتلون دل کے لیے کافی نہ ہو پائے
سو میں نے اٹھائے اپنے آنسو
اور تمہیں بنا دیا ایک سمندر
تا کہ تم زمین پہ ہادیگری کرتے چلو
اور اس ناممکن خزانے کو کھوج نکالو
جس کی تمہیں مستقل تلاش ہے
البتہ ضرور ہر صبح....
میرا سورج تم کو بیدار کرنے کے لیے موجوں ہوگا

www.facebook.com/nemrah.ahmed.official

#TeamNA

ہر رات میرا چاند حاضر ہوگا
تمہاری تشریف کے لیے
اور اگر کبھی تمہیں ہومیری طلب
تو دیکھنا ستاروں کے درمیان
ہر ایک تارے کے گرد لپٹی
میں وہیں ٹھہری ہوئی ملوں گی!

Mirtha Michelle Castro Marmol

صبح دھیرے دھیرے فوڈی ایور آفٹر کے گرد دھند لکھنے جارہی تھی۔ ٹھنڈا ہوا ناشتہ یونہی ڈھکار کھا تھا اور زمر یوسف باز دھیر پہ
بچائے سیران پہ لگائے سورہی تھی۔ دروازے کالا کھلنے کی آواز آئی تو اس کی آنکھ کھلی۔ پھر وہ تیزی سے سیدھی ہوئی اور نیند سے بھری
آنکھوں سے ادھر ادھر دیکھا۔ بیرونی دروازہ کھول کر جنید اندر داخل ہو رہا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ رکا۔ آنکھوں میں حیرت در آئی۔
”آپ؟ اس وقت؟“ اس نے گھڑی کی بجائے مڑ کر آسمان کے رنگ کو دیکھا۔ وہ بال کانوں کے پیچھے اڑتی ابھی ابھی سی اپنا سیل فون
اٹھا کر دیکھنے لگی تھی۔ ”قارس نظر آیا کہیں جنید؟“

”نہیں تو۔ مگر آپ کیسے آئیں؟ باہر تو کوئی کار نہیں کھڑی۔“

زمر چونک کر اسے دیکھنے لگی۔ ”قارس کہاں گیا؟ کار بھی لے گیا؟“ وہ اسے کال ملانے لگی۔ گھنٹیاں جا کر پلٹ آئیں مگر جواب نہ
ملا۔ جنید ناشتے کے برتن نظر انداز کرتا کچن کی طرف بڑھ گیا۔ (کچن میں رات کے معرکے کے نشانات وہ حتی المقدور صاف کر چکی تھی)
قارس کا پیغام چند لمحوں بعد موصول ہوا۔ ”ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ تم گھر چلی جانا۔“

زمر کے ابرو تن گئے۔ آنکھوں میں دبا دبا سا غصہ ابھر آیا۔ اس نے پرس اٹھایا، موبائل اندر پھینکا اور باہر نکل آئی۔
”کیب سے جاؤں گی کیا اب؟ اتنا بھی خیال نہیں آیا اسے۔“ اس کا سارا موڈ خراب ہو چکا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کتنے عاجز ہیں ہم کہ پاتے ہیں

بندے بندے میں بو خدائی کی

صبح کی دودھیار روشنی میں سورج کی سنہری تاریں ملیں تو آسمان مزید روشن ہو گیا۔ ایسے میں اس بلند عمارت کی بالائی ترین منزل کے
کارز آفس میں ہاشم اپنی پاور چیر پہ موجود تھا۔ گرے سوٹ اور ٹائی میں ملبوس بال جیل سے پیچھے کو جمائے آنکھوں پہ عینک لگائے وہ چند
کاغذ پڑھ رہا تھا۔ سامنے کرسی پہ احمر شفیع اٹھے کندھوں کے ساتھ گھٹنے ملا کر بیٹھا اسے بغور دیکھ رہا تھا۔

ہاشم نے دفعتاً عینک اتاری اور چہرہ اٹھاتے ہوئے کانغذ میز پہ ڈالے۔

”بے کار ہے یہ سب۔ اس میں کہیں ثابت نہیں ہوتا کہ حسین نے اوسی پی کو بلیک میل کیا تھا۔“

”لیکن اس سے یہ ثابت ضرور ہوتا ہے کہ اس نے اوسی پی کی بیٹی کی ویڈیو تباہ کرنے کے عوض کوئی تحفہ وصول کیا تھا، وہ ان میلز میں حمیرا کو

یہی بتا رہی ہے، مگر ظاہر ہے حمیرا یہ نہیں سمجھ سکی کہ یہ تحفہ لیک شدہ پیپرز تھے۔“ امر بے چینی سے بولا۔

”میں مانتا ہوں ایسا ہی ہوا ہوگا، لیکن کوئی ثبوت نہیں ہے اس بات کا۔“ ہاشم نے کندھے اچکائے تھے۔ امر گہری سانس لے کر کھڑا

ہوا۔ ”پھر میں نئی نوکری تلاش کرنا شروع کر دیتا ہوں سر۔ شکر یہ آپ نے میری بات سنی۔“ وہ واپس مڑا اور چند قدم دور گیا جب ہاشم نے

پکارا۔

”تم اپنے آفس میں واپس آ چکے ہو۔ میں بات کر کے مکر نہیں جاتا۔ میں اس کو دوسرے طریقے سے استعمال کرنے کا ارادہ رکھتا

ہوں۔“ وہ اب فون اٹھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ امر نے مڑ کر اسے دیکھا اور مسکرایا۔

”شکر یہ سر۔“ وہ ہار نکلا اور دروازہ بند کر کے مکانات میں لہرایا ”بس!“ اور آگے بڑھ گیا۔ حلیمہ نے بے اختیار اسے سر اٹھا کر دیکھا تھا۔

اندر ہاشم فون کان سے لگائے میز پر رکھی اپنی ڈاک کھول رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ ناخوشی سے انگریزی میں تیز تیز بولتا جا رہا تھا۔

”کون سا کیس؟ کوئی کیس نہیں چلے گا۔ میں نے چھ ماہ سے پہلے اگلی تاریخ نہیں لیتی دینی ان کو۔ بوڑھا کروں گا ان کو یونہی۔“

ڈاک الگ الگ کرتے ہوئے اس نے چند لفافوں کو بنا کھولے ردی کی نوکری میں اچھال دیا اور کچھ کو علیحدہ رکھ دیا۔ اور یہ تبھی تھا

جب اس نے وہ لفافہ دیکھا۔ بات کرتے ہوئے اس کے ابرو بھینچے۔

وہ پرانے کانغذ کا پیلا زرد سا لفافہ تھا۔ دیکھنے سے بھاری معلوم ہوتا تھا۔ اس نے تعجب سے موبائل رکھتے ہوئے اسے اٹھایا۔ الٹ پلٹ

کر دیکھا۔ پھر پیرنائف کے ساتھ لفافہ چاک کیا۔ اندر کوئی دیر شے تھی۔ ہاشم نے انگلی سے کھینچ کر اسے باہر نکالا۔

وہ ایک سبز پاسپورٹ تھا۔ فرنٹ کور اور چند صفحات۔ اس نے پہلا صفحہ پلٹایا اور... ایک دم وہ سیدھا ہو کر بیٹھا۔ پاسپورٹ ہولڈر کی

تصویر سامنے تھی۔ بڑھی شیو والا سعدی یوسف۔ لیکن... پاسپورٹ اذھورا تھا۔ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ پھر لفافے میں جھانکا۔ اندر

ایک اور پرانے طرز کا کانغذ تہہ کیا رکھا تھا۔ ہاشم نے اسے نکالا۔ اس پر انگریزی میں گویا قلم دوات سے چند الفاظ تحریر تھے۔

”سعدی یوسف کو عدالت میں دہشت گرد ثابت کرنے کے لئے یہ پاسپورٹ کافی ہے۔ لیکن اس کا مکمل ہونا ضروری ہے۔ اس نے یہ

ٹریش کین میں اچھال دیا تھا۔ میں نے اس کے سارے ٹکڑے جمع کر لیے ہیں۔ اگر تم چاہتے ہو کہ میں اسے تمہیں مکمل کر کے دوں تو اپنے

ٹویٹر اکاؤنٹ سے یہ نمبر لکھ کر ٹویٹ کر دو۔ میں سمجھ جاؤں گا۔“

نقطہ

ایک خیر خواہ۔

نیچے ایک نمبر درج تھا۔ ریاضی کے چند بے سرو پا ہندسے۔ وہ کچھ دیر سوچتا رہا، پھر اس لفافے سمیت تمام اشیاء کو دراز میں ڈال دیا۔ اسی پہ اس کا فون بجا۔ بلا کڈ نمبر کا لنگ۔ اس نے موبائل کان سے لگاتے ہوئے احتیاطاً ہیلو کہا۔

”سر.... کیا آپ میری بات سن سکتے ہیں؟“ وہ خاور تھا۔ ہاشم نے ایک نظر بند دراز کو دیکھا اور پھر گہری سانس لی۔

”میں نے سعدی یوسف کی جان بچائی تھی، خاور۔ میرے اس کے ساتھ بہت سے اختلاف تھے اور اپنی اس ویڈیو کے بعد میں اس سے نفرت کرنے لگا ہوں لیکن ایک محب وطن لڑکے کو وہ بہت گروہ قرار دے دینا.... یہ ظلم میں نہیں کرنا چاہتا۔ کسی کو مارنا الگ بات ہے۔ جیتے جی مارنا بالکل الگ۔ اور مجھے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ یہ کس کبھی عدالت میں نہیں چلے گا۔ اس لیے مجھے اس پاسپورٹ کی ضرورت نہیں ہے جو تم رشوت کے طور پر بھیج رہے ہو مجھے۔“

”سوری سر؟ کون سا پاسپورٹ؟“ وہ اپنی جگہ الجھ گیا تھا۔ ”میں نے آپ کو کچھ نہیں بھیجا سر۔“ پھر روانی سے بولا۔ ”اگر آپ مجھے اپنے بندوں سے تلاش کروانے کی بجائے میری بات سن لیں تو میں آپ کے والد کے قتل کا معاملہ حل کرنے کے لیے تیار ہوں۔ لیکن اس کے لیے آپ کو مجھ پر اعتبار کرنا ہوگا۔“ پھر وہ ٹھہر کر بولا۔ ”آپ کے لئے میں نے اپنی زندگی کے اتنے سال لگا دیے، مگر آپ نے مجھ سے ایک دفعہ بھی نہیں پوچھا کہ میں بے گناہ تو نہیں ہوں؟ کیا میرا اتنا بھی حق نہ تھا؟ سر! ایک دفعہ تو پوچھا ہوتا سر کہ میرے باپ کا قاتل کون ہے؟ پھر میں پاتال سے بھی اس کو کھینچ کر لے آتا، مگر آپ اس لڑکے کی باتوں میں آ گئے۔“

”سنو خاور! جلد یا بدیر میرے آدمی تمہیں ڈھونڈ لیں گے۔ اس لیے اب دوبارہ فون نہ کرنا۔“ ناگواری سے کہتے اس نے فون رکھ کر لیپ ٹاپ کھولا۔ البتہ دماغ کی ایک نئی مسلسل جلنے بجھنے لگی تھی۔ اگر خاور نہیں تھا تو یہ کون سا تیسرا فریق تھا جو درمیان میں کود پڑا تھا؟ چند منٹ ہی وہ کام کر پایا اور پھر ایک دم سے اس نے فون اٹھایا اور ایک نمبر ملا کر اسے کان سے لگایا۔ ماتھے پہ ہل ڈالے وہ ٹھنٹی سنتا رہا۔

”تم نے کہا تھا تم اس آخری چیز کی قیمت لگاؤ گی، کیا وہ یہ پاسپورٹ ہے جو تم نے مجھے بھیجا ہے؟“

”کون سا پاسپورٹ؟“ ٹھٹھٹھانے حیرت سے دہرایا تھا۔

”اداکاری مت کرو۔“ وہ اکتا کر کہہ رہا تھا جب.....

”تمہارا ایک میموری کارڈ تھا میرے پاس۔“ ہاشم ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا۔

”تمہارے باپ کا کمپیوٹر ہیک کیا تھا میں نے یاد ہے؟ وہیں سے کچھ ملا تھا مجھے۔ مگر وہ معلومات ایسی تھیں کہ میں ان کو استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ سوچا کسی اور کو دے دوں ورنہ تم تو میری جان لے لو گے۔ خیر اب وہ سب میرے لیے بے کار ہے اور وہ تمہیں بھی نہیں اب ملے گا۔ رہی میں.... تو میں ملک چھوڑ کر ہمیشہ کے لئے تمہاری زندگیوں سے جا رہی ہوں۔“

ہاشم فون بند کر کے سوچتا رہا۔ اگر وہ سچ کہہ رہی تھی تو بھی اور انگزیب کے کمپیوٹر میں کم از کم وارنٹ غازی کی فائلز تو تھیں نہیں سو وہ اس کے ہاتھ نہیں لگی ہوں گی۔ باقی ہر چیز کی خیر ہے۔ سر جھٹک کر وہ دوبارہ کام کرنے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اس بار وہ تلخی بہہ دھسے بھی نہیں ہم
اب کہہ لڑائی ہے کہ جھگڑا نہ کریں گے ہم

ہسپتال کی چمکتے فرش والی راہداری خاموش اور سرد پڑی تھی۔ فارس نے کمرے کے دروازے پر انگلی کی پشت سے دستک دی پھر
دروازہ دھکیلا تو اندر کا منظر کھلتا چلا گیا۔

بیڈ پہ لحاف مٹانے آبدار فیک لگائے بیٹھی تھی اور ایک نرس اس کے پیچھے نیچے براہِ کر رہی تھی۔ اس کے سرخ بال پونی میں بندھے تھے اور
چہرے پر مردنی چھائی تھی۔ کلاسیاں سخت ٹیوں میں بندھی تھیں اور وہ برے موڈ کے ساتھ نرس سے فقاہت سے کچھ کہہ رہی تھی جب آہٹ سنی
تو چہرہ پھیرا۔

اسے چوکھٹ میں کھڑے دیکھ کر نگاہوں میں تحیر آئی۔ سانس بھی ختم گیا۔ پھر سر کے خم سے اندر آنے کا اشارہ کیا۔
وہ سلام کہتا اندر داخل ہوا۔ کمرہ کافی وسیع و عریض اور پر تعیش تھا۔ وہ کھڑکی کے قریب رکھے شاہانہ طرز کے کاؤچ پہ بیٹھ گیا اور ٹانگ پہ
ٹانگ چڑھائی۔ پھر لیوں پہ بند مٹھی رکھے خاموشی سے آبدار کو دیکھنے لگا۔ آبی نے نظریں جھکالی تھیں۔ نرس ہانگی تو وہ ہلکے سے کھٹکھٹا رہا۔
”کیسی طبیعت ہے آپ کی؟“

آبدار نے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا پھر فقاہت سے مسکرائی۔ ”اب ٹھیک ہوں۔“ ذرا رکی۔ ”بابا سے ملاقات ہوئی آپ کی؟“
”میری شکل پہ گدھا لکھا ہے کیا جوان کے ہوتے ہوئے ادھر آتا؟ وہ نکلے ہیں تو آیا ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے بولا تھا۔ انداز میں کاٹ سی
تھی۔ وہ چپ ہو گئی۔ نظریں جھکا لیں۔

”کیوں کیا آپ نے ایسا؟“ اب کے وہ نرمی سے بولا تو وہ اپنے ٹیوں میں بندھے ہاتھوں کو دیکھنے لگی۔ آنکھیں پانیوں سے مہر گئیں۔
”مجھے اور کچھ سمجھ نہیں آیا۔ آپ میری کال نہیں اٹھا رہے تھے۔“

”تو اگر آپ کو کچھ ہو جاتا تو اٹھا لیتا آپ کی کال؟ ایسے کون کرتا ہے؟ اپنے والد کا تو سوچنا تھا۔“ آبدار نے بھیگی آنکھیں اٹھائیں۔
وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کے آنسو گالوں پہ لڑھک رہے تھے۔ ”میں نے آپ کو اتنی کالز کیں آپ کیوں نہیں آئے؟“
”میں مصروف تھا۔“

”کس کے ساتھ؟“ اس نے آنکھیں اٹھا کر تیزی سے پوچھا تو وہ اتنی ہی تیزی سے بولا۔

”آپ کو حق ہے یہ پوچھنے کا؟“

آبدار کی اس پہ جی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔ ”آپ چلے جائیں۔“ اور وہ پیچھے سے اپنے نیچے جوڑنے لگی گویا اسے
جانے کا عندیہ دے کر اب لیٹنے لگی ہو۔

”آبدار!“ وہ کہتے ہوئے اٹھا مگر دروازے کی طرف جانے کی بجائے اس کی جانب قدم بڑھائے۔ ”آپ کو اپنا خیال رکھنا چاہیے تھا۔“ اس کی آواز میں نرمی تھی۔ وہ نیچے جوڑتی رک گئی۔ چہرہ اٹھا کر بلی جیسی آنکھوں سے اسے دیکھنے لگی جو ابھی تک بھٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اس کے قریب آ کر کاتو وہ بیٹھے بیٹھے ڈرا پرے ہوئی۔ وہ آہستہ سے اس کے بازو کے قریب بیڈ پہ بیٹھا۔

”اگر آپ کو مجھے بلانا تھا تو اس کے دوسرے طریقے بھی تھے۔ یہ سب کر کے آپ نے مجھے تکلیف دی ہے۔“ وہ اسے فکر مندی سے دیکھتے ہوئے کہہ رہا تھا اور آبی کی بھٹکی آنکھیں بے خودی کے عالم میں اس پہ جمی تھیں۔

”مجھے فسوس ہے اگر میری وجہ سے آبدار آپ کو کبھی کوئی غلط تاثر ملا، مگر میری نیت ہمیشہ صاف رہی۔ میں ایسا آدمی نہیں ہوں۔“ وہ اس پہ نظریں جمائے دکھ سے کہہ رہا تھا۔ ”کیونکہ میں نے اپنی ساری زندگی بہت احتیاط سے گزاری ہے۔ جس کے اوپر دل ہمارا اس کے نام کو بھی اپنے نام کے ساتھ آلودہ ہونے نہیں دیا اس لئے کوئی آپ کے نام کے ساتھ میرا نام جوڑے مجھے اس بات نے بہت پریشان کیا ہے۔ اسی لئے ادھر آیا ہوں۔“ وہ نرمی سے اسے سمجھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔ آبی کے لب مسکراہٹ میں ڈھلتے گئے۔ آنکھیں ہنوز ڈبڈبائی ہوئی تھیں۔

”آپ کبیری فکر تھی؟“

”ظاہر ہے مجھے فکر تھی!“ اسی نرمی سے کہتے ہوئے فارس نے ہاتھ بڑھایا اور اس کا پیچوں میں لپٹا ہاتھ تھاما۔ آبدار کا سانس رک گیا۔ وہ ایک ٹک سے دیکھے گئی۔ ”اسی لئے میں چاہتا ہوں کہ آپ دوبارہ کبھی ایسی حرکت نہ کریں۔“ اس کی آنکھیں آبی کی آنکھوں پہ جمی تھیں اور دونوں ہاتھوں میں اس کی ہانی کلائی تھام رکھی تھی۔

”پہلے آپ وعدہ کریں کہ میرے بلانے پہ آجایا کریں گے۔“

فارس نے گہری سانس لی۔ ”میں..... وعدہ کروں؟ میں بس عبید ایک شادی شدہ آدمی ہوں۔ کیا آپ کو معلوم ہے کہ ایک شادی شدہ آدمی کو کیسے ڈیل کیا جاتا ہے؟“

”کیسے؟“ وہ چیلنجنگ انداز میں مسکرائی۔ وہ اسے دیکھتا رہا۔ چند پل۔ چند ساعتیں۔ بنا پلک جھپکے۔ اور پھر ایک دم فارس کی انگلیوں نے اس کی کلائی کی پٹی کو جھٹکا دیا۔ آبدار کی کراہ نکلی مگر اس سے پہلے کہ وہ ہکا بکاسی اپنا ہاتھ چھڑاتی، وہ ہشتی سے ایک ہاتھ سے اس کی کلائی تھامے دوسرے سے اس پہ لپٹی پٹی کھینچ کر اتار رہا تھا۔

”چھوڑیں۔ کیا کر رہے ہیں؟“ وہ چلائی مگر فارس نے پٹی کی آخری تہہ نوچ کر پرے پھینکی اور اس کی کلائی اٹھائی۔ وہ بے داغ تھی۔ خراش تک نہ تھی۔

”جس طرح آپ کے والد صاحب نے مجھ سے بات کی مجھے بہت برا لگا۔ وہ ہوتے کون ہیں مجھے قصور وار ٹھہرانے والے۔“ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے وہ غرایا تھا۔ آبدار کا چہرہ سفید پڑا۔ آنسو تک خشک ہو گئے۔ ”میں نے آبدار بی بی چار سال جیل میں گزارے

ہیں۔ وہاں ایسے ایسے لوگ ہوتے تھے جن کی شکل دیکھ کر بھی آپ کی جان نکل جائے گی، میں نے ان کے ساتھ سروائیو کیا ہے۔ آپ کے یہ بے کار ڈرامے سروائیو نہیں کروں گا کیا؟“ اس کی کلائی کو زور کا جھٹکا دے کر چھوڑا۔ وہ شل سی اسے دیکھ ہی تھی۔ وہ سرخ پڑتی آنکھیں اس پہ جمائے انگلی اٹھا کر بولا۔ ”آسمندہ اگر آپ نے مجھے کال کی یا میرے نام کے ساتھ اپنا نام جوڑنا چاہا یا میرے گھر اور ریسٹورانٹ کا رخ بھی کیا تو میں کس حد تک جاسکتا ہوں یہ بتانے کی ضرورت نہیں ہے مجھے۔ بات آئی ہے دماغ میں یا نہیں؟“ غصے سے بولتا وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ آبی نے شل نظریں اٹھا کر اسے دیکھا۔

”تو آپ یہاں صرف اپنا نام صاف کرنے آئے تھے۔“

”جی ہاں۔ کیونکہ جب میں نے آپ کو بھی کوئی غلط تاثر نہیں دیا تو آپ کی ان جذباتی حرکتوں کے لئے مجھے ذمہ دار نہ ہی ٹھہرائیں آپ کے والد صاحب تو اچھا ہے۔ میں ان کے باپ کا ملازم نہیں ہوں جو ان کی باتیں سنوں گا۔ اس لیے ان سے کہیے گا، میرے منہ نہ لگیں آسمندہ!“ یہی سے بولتا ایک قبر آلود نظر اس پہ ڈالتا اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

فارس دروازے تک پہنچا تھا جب اسے آواز آئی۔ اس نے چونک کر مڑ کر دیکھا۔ وہ اپنی دوسری کلائی کی پٹیاں نوچ نوچ کر اتار رہی تھی۔ فارس کے ابرو اکٹھے ہوئے مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے روک پاتا، وہ کلائی بردہ کر چکی تھی۔

”یہ ہے وہ جو میں نے کالی تھی۔“ گدہ آمیز نظروں سے اسے دیکھتی وہ بولی تھی۔ فارس نے بے اختیار اس کی پہلی کلائی کو دیکھا جو سوائے ذرا سی کھروچ کے صاف تھی البتہ یہ والی کلائی.... یہ بری طرح زخمی دکھائی دیتی تھی۔ لمبے بھر کو وہ کچھ بول نہیں سکا۔

”وہ... تمہارے لیے... فارس غازی... ایسا... کبھی نہیں کرے گی۔“

فارس نے بڑی مشکل سے قدم اٹھائے تھے۔ وہ کچھ کہہ بغیر تیزی سے باہر نکل گیا۔ وہ اب ہذیبانی انداز میں خود سے لگی سوئیاں اور نالیاں نوچ نوچ کر چھینکنے لگی تھی۔ اس کے برف ہوئے آنسو اب روانی سے گرنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سواہر درمیں تنہا کھڑا ہوں

پلٹ جاؤں مگر موسم نہیں ہے

سورج کی نرم گرم روشنی مورچال کو اس دھند آلود صبح میں بھی دہکار ہی تھی۔ زمر واپس آکر اندر جانے کی بجائے لان میں گھاس پھکے جھولے پہ آ بیٹھی تھی۔ ٹھنڈی ہوا اس کے گلنگریا لے ہال اڑا رہی تھی مگر وہ بے نیازی اسی طرح بیٹھی، آنکھیں موندے جھولا لیتی رہی۔ جوتے اور پرس گھاس پہ ہی ادھر ادھر لڑھکے پڑے تھے۔

بالائی منزل کی کھڑکی سے اندر جھانک کر حسین لب ناپ کے آگے جڑی بیٹھی تھی۔ دلچسپی سے وہ اسکرین پہ لکھی عبارتیں پڑھ رہی تھی۔ ساتھ بیڈ پہ اکثر وہ بیٹھا اسامہ تھوڑی گھنٹے پہ چکائے گم صم سا نظر آ رہا تھا۔

نچی منزل کا منظر کسی عام صبح سے مختلف لگتا تھا۔ ندرت اور حسینہ کچن میں تھیں۔ ناشتے کی مہک پرائٹھوں کی خوشبوئیرتوں کی اٹھاٹخ ندرت بہن بہت جوش سے اہتمام کرنے میں لگی تھیں۔ لاؤنج میں بیٹھے ہا بھی صداقت کو ڈپٹ ڈپٹ کرا ایک ایک کو نا صاف کرنے کو کہہ رہے تھے۔ جانتے تھے سعدی زمر کی طرح کتنا نفاست پسند تھا۔ حسینہ کو خوب تاؤ چڑھ رہے تھے۔ (نرا ڈرامہ ہے سارا خاندان۔ ناں میں پوچھتی ہوں اس زخم والے منہ لئے سوکھے سڑے لڑکے میں رکھا کیا ہے جو سب اس کے لئے پاگل ہو رہے ہیں۔ سیدھے منہ سلا متو اس نے مجھے کیا نہیں۔ اب تہوں والے پراٹھے بناؤ اس کے لئے۔) وہ رات سے پھر کی کی طرح کھوم رہی تھی اور اب دل چاہ رہا تھا۔ اس پراٹھے میں زہر ملا دے۔ بیلن کو آٹے پہ برابر کرتے بڑبڑاتے ہوئے اس نے سر اٹھایا تو چوگی۔

سعدی کندھے پہ بیگ لئے چہرہ جھکائے کچن کے باہر کھلتے دروازے سے باہر نکل رہا تھا۔ ندرت ابھی ابھی لاؤنج میں گئی تھیں۔ (سعدی دوسری جانب سے آیا تھا) سو کسی نے اسے آتے نہیں دیکھا۔ حسینہ چند لمحے تو کھڑی رہی پھر بیلن رکھ کر باہر نکل۔ ندرت اور ہا مشترکہ طور پہ صداقت کو ڈانٹ رہے تھے۔ سم زینے اترتا آرہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا۔ وہ آخری سیڑھی تک پہنچا تو حسینہ نے کمر پہ ہاتھ رکھے آنکھیں گھما کر مزے سے اطلاع دی۔ ”اسامہ بھائی.... وہ تو چلا گیا سامان سمیت۔ اب ناشتہ بناؤں یا نہ بناؤں؟“

”کون؟“ اسامہ سر اٹھا کر نا سمجھی سے اسے دیکھنے لگا اور پھر جس لمحے اسے سمجھ آئی.... وہ ایک دم باہر کو بھاگا۔ لاؤنج ایک جست میں عبور کرنا وہ پوری جگہ کے دروازے سے باہر جانکا۔ حسینہ نے (ہونہ) سر جھکا۔ (پاگل!)

اسامہ نے باہر آ کر گردن ادھر ادھر گھمائی۔ وہاں سعدی کہیں نہ تھا۔ صرف زمر جھولے پہ آنکھیں موندے سر پیچھے گرائے بیٹھی تھی۔

”بھائی چلا گیا، پھپھو!“ زمر نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ وہ حواس باختہ سا اس تک آ پہنچا تھا۔

”آپ نے بھائی کو جاتے دیکھا؟“

”ہاں دروازہ کھلنے کی آواز سنی تھی۔ دھیان نہیں دیا.... مگر وہ آیا کب؟ اور وہ چلا کیوں گیا؟“ وہ حیران سی جگہ سے اٹھی۔ یاد آیات فارس فون پہ کچھ کہہ رہا تھا۔ اسامہ نے رو ہانسا ہو کر اسے دیکھا۔

”کیونکہ میں نے ان کو کہا تھا کہ....“

باہر گئے درختوں کی قطار کے ساتھ سڑک پہ وہ سر جھکائے چلتا جا رہا تھا۔ بیگ کندھے پہ تھا اور ہاتھ جینز کی جیبوں میں تھے۔

”سعدی!“ اس نے وہ آواز سنی تو قدم زنجیر ہوئے۔ وہ ٹھہرا۔ پھر دھیرے سے مڑا۔

دور.... دس بارہ میٹ کے فاصلے پہ زمر کھڑی تھی۔ رات والے جھلملاتے سیاہ لباس پہ جیکٹ پہنے، ٹنگریا لے ہال آدھے باندھے وہ بہت دلگرفتہ سی اسے دیکھ رہی تھی۔ وہیں دور کھڑی.... ننگے پاؤں، اس سے چند قدم وہ پیچھا سامہ کھڑا تھا مگر اس نے چہرہ جھکا رکھا تھا۔

سعدی کے چہرے پہ کرب سا ابھرا۔ زمر پہ اپنا نیت بھری نظریں جمائے وہ بار بار کچھ کہنے کو لب کھولتا پھر بند کر دیتا۔ پہلو میں گری مٹھیاں کبھی بھینچ لیتا، کبھی ڈھیلی چھوڑ دیتا۔

ننگے پاؤں کھڑی زمر نے سینے پہ بازو لپیٹے اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ اسے دیکھا۔

”خدا حافظ کہے بغیر جا رہے تھے کیا؟ اور اس سلام کا کیا جو خدا حافظ سے پہلے کہنا تھا؟“

سعدی اپنی جگہ سے نہیں ہلا۔ وہیں کھڑا اسے انہی مغموم نظروں سے دیکھتا رہا۔ دونوں کے درمیان کئی گز کا فاصلہ تھا۔

”سلام!“ اس نے سر کے خم سے سلام کیا۔ آواز گیلی روکھی سی تھی۔

”تم ہماری سلامتی چاہتے ہو تو جا کیوں رہے ہو؟“ وہ ٹھہرے ہوئے انداز میں اونچی کر کے بولی تھی۔

”نہیں رہ سکتا یہاں۔ وحشت ہوتی ہے مجھے۔ دل ٹوٹا ہوا ہے میرا۔“ وہ جب بولا تو الفاظ سرگوشی میں ادا ہوئے، مگر نگاہیں زمر پہ جمی

رہیں۔ ان میں بے چارگی، خود رسی، شکستگی، سب کچھ تھا۔

”ایسا ہی ہوتا ہے۔ جب تین گولیاں لگتی ہیں اور سارے اپنے چھوڑ جاتے ہیں ایسا ہی لگتا ہے۔“ وہ پکار کر بولی تھی۔ ”جیسے سب آپ

کے بغیر مزے کر رہے ہیں اور صرف آپ تنہا اذیت کاٹ رہے ہیں۔ میں اس سے گزر چکی ہوں۔ تم گزر رہے ہو۔ چناؤ تمہارے ہاتھ میں

ہے۔ وہ کرنا ہے جو میں نے چار سال پہلے کیا تھا؟ سب کو اپنی زندگی سے باہر دھکیل کر دروازے بند کر کے خود کو اکیلا کرنا ہے۔ یا پھر دروازہ

کھولنا ہے؟ اور روشنی کو اندر آنے دینا ہے؟ کیونکہ کچھ لوگ اس قابل ہوتے ہیں کہ ان کے لئے پگھلا جائے۔“ بولتے بولتے اس کو سانس

چڑھنے لگی تھی مگر اس پہ نگاہیں جمائے وہ کہے جا رہی تھی۔ ”تم نے چنا ہے تم نے فیصلہ کرنا ہے... اپنے خاندان سے دور رہ کر خود کو جوڑ لو

گے تو جاؤ خدا حافظ کہہ کر نکل جاؤ اور اگر میری غلطیوں سے سبق سیکھنا ہے تو واپس آؤ اور مجھے سلام کہو۔“ وہ کہہ کر سینے پہ بازو لپیٹے کھڑی منتظر

سی اسے دیکھتی رہی۔ اس کا دل اندر بہت زور سے دھک دھک کر رہا تھا۔ اگر وہ چلا گیا تو؟

”میرے اندر کا ہر سب کو ہرٹ کرے گا اگر میں یہاں رہا تو۔“

”نہیں سعدی۔ بات یہ ہے کہ تمہیں نفرت ہے اس کام سے جو حنین نے کیا کیونکہ تمہیں محبت ہے حنین سے۔ فیصلہ تم نے کرنا ہے۔ اس

کے کام سے نفرت زیادہ شدید ہے یا اس کی محبت زیادہ شدید ہے۔ جس میں زیادہ شدت ہوگی وہ تم سے چناؤ کروالے گی۔“

سعدی نے خالی خالی آنکھوں سے اسے دیکھا.... اور اس کے عقب میں چہرہ موڑے کھڑے سم کو۔ ”مجھے نہیں لگتا اب کسی کو میری

ضرورت ہے۔ سب میرے بغیر رہنا سیکھ چکے ہیں۔“ اسامہ کے جھکے چہرے پہ ایک آنسو لڑھکا تھا۔

”اسی لیے سب تمہیں اپنی زندگی میں واپس لانا چاہتے ہیں۔ ضرورت کے تحت نہیں۔ کسی کو تمہاری ضرورت نہیں ہے سعدی۔ مگر محبت

کے تحت۔ اور کیا تمہیں ابھی تک سمجھ نہیں آیا کہ رشتے وہ زیادہ خالص ہوتے ہیں جن میں محبت ضرورت پہ حاوی ہو جائے۔“

اور اس لمحے.... گھنے دھتوں کی قطار کے قریب چھایا میں کھڑے سعدی یوسف کو اس دھندلی صبح سب کچھ صاف نظر آنے لگا تھا۔ ایک

دم سے دماغ اور دل کے آئینے کی ساری گرد کسی نے ہاتھ پھیر کر صاف کر دی تھی۔ وہ چونک کر زمر کو دیکھنے لگا۔ وہ ابھی تک سینے پہ بازو لپیٹے

کھڑی، محبت بھری نظروں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

سعدی نے بیک نیچے ڈال دیا۔ پھر قدم قدم چلتا وہ قاصد عبور کرنے لگا۔ زمر وہیں کھڑی رہی۔ وہ آگے بڑھتا آیا۔ یہاں تک کہ اس کے بالکل مقابل آکھڑا ہوا۔ پھر بھیگی آنکھیں اٹھائیں اور ”السلام علیکم!“ کہتے ہوئے اس کے گرد اپنے بازو لپیٹ کر اسے خود سے لگایا۔۔۔
”میں کہیں نہیں جا رہا۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔“

اسامہ خاموشی سے سعدی کی سابقہ جگہ تک آیا اور اس کا بیک اٹھا کر گھر کی طرف بڑھ گیا۔ زمر نے اس سے علیحدہ ہوتے مسکرا کر غم آنکھوں سے اس کے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے اسے دیکھا۔ ”وہیکم ہوم!“

یہ وہ بچہ تھا جس کو اس نے انگلی پکڑ کر چلنا سکھایا تھا۔ جو رات کو کہانی سنے بغیر نہیں سوتا تھا۔ اسے آج بھی کہانیاں سنانے کی ضرورت پڑتی رہتی تھی۔ وہ صرف ”ہاتوں“ سے سمجھتا تھا۔ اسے صرف ہاتوں کا فن آتا تھا۔ اس کو یوں اپنے سامنے دیکھ کر... ہسپتال کی رات جب سے وہ کھویا تھا... سے لے کر نو ماہ بعد... اس کو یوں اپنے سامنے کھڑے دیکھنا... اس کے بالوں پہ ہاتھ پھیرنا اسے مسکرا کر تسلی دینا... زمر کو لگ رہا تھا اس کی ساری دنیا واپس مل گئی ہے۔ وہ پہلے سے دبلا پتلا ہو گیا تھا۔ کمزور۔ منہ کا زخم بھی قدرے مندمل تھا مگر بہر حال موجود تھا۔
”سچ بتاؤ کیا اس نے بہت زور مارا تھا تمہیں؟“ وہ اس کی کہنی تھامے گھر کی طرف ٹہلتے ہوئے واپس آتی اس سے پوچھ رہی تھی۔
سعدی نے چونک کر اسے دیکھا۔ ”کس نے؟“
”فارس نے۔“

”ایسا کچھ نہیں ہے۔“ وہ نگلی سے سر جھٹک کر سامنے دیکھتا چلنے لگا۔ زمر نے گہری سانس بھری۔ اسے کیوں بھول گیا تھا کہ وہ چھ مہینے کا ایک نوجوان تھا جو کبھی اپنے گھر کی عورتوں کے سامنے مار کھانے کا تذکرہ نہیں کر سکتا تھا۔

اتنے عرصے بعد ملے تھے۔ وہ موقع کی مناسبت سے اس سے چھوٹی چھوٹی مگر محتاط سی باتیں کرتی اندر کی طرف بڑھ گئی۔ وہ زیادہ جواب نہیں دے رہا تھا۔ بس چپ تھا۔

وہ دونوں گیٹ سے اندر چلے گئے مگر اسامہ اس کا بیک لئے وہیں پورچ کے ایک کونے میں بیٹھا رہا۔ وہ کسی گہری فکر مند سوچ میں تھا جب باہر سے کار اندر آتی دکھائی دی۔ تب وہ جگہ سے اٹھا۔ فارس ڈرائیونگ ڈور کھولتا چابی جیب میں اڑستا باہر نکل رہا تھا۔ اسے یوں بیٹھے دیکھ کر امد و تعجب سے اکٹھے ہوئے۔

”اے... تم ادھر کیا کر رہے ہو؟ اسکول نہیں جانا؟“ وہ لمبے ڈگ بھرتا اس تک آیا۔

”سعدی بھائی گھر چھوڑ کر جا رہا تھا۔ شکر ہے زمر پھپھو نے روک لیا۔“ اس نے ہلکے پھلکے انداز اور ہلکے دل کے ساتھ اطلاع دی۔ فارس کے ماتھے پہ بل پڑے۔ غصے سے اندر کھلتے بند دروازے کو دیکھا۔

”جناب کا دماغ درست نہیں ہوا ابھی تک۔ دو ہاتھ اور لگنے چاہیے تھے۔ اس کی تو آج میں طبیعت صاف کرتا ہوں۔“

”ماموں!“ سیم نے نگلی سے اسے دیکھا۔ مگر وہ سر جھٹک کر اندر چلا گیا تھا۔

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
ناؤلز اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

ڈائننگ ٹیبل پر ناشتے کے برتن سجے تھے۔ خدمت تازہ پراٹھے لا کر رکھ دی تھیں۔ سعدی اب مسکرا کر باسے دھیمی آواز میں بات کر رہا تھا۔ فارس کو دور سے آتے دیکھا تو سر کو مخض ڈرا سا خم دیا۔ فارس لیوں پہ مسکراہٹ جمائے اس تک آیا۔ اس کا کندھا زور سے دبا یا۔ ”ویکم ہوم سعدی!“ مسکرا کر کہتا اس کی طرف جھکا اور اس کے کان کے قریب سرگوشی کی۔

”زیادہ ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں ہے ہیرو۔ واپس آگئے ہو تو تمیز سے گھر میں رہو۔ ماں کا خیال ہے یا نہیں؟ اب کوئی الٹی سیدھی حرکت کی تو دیکھنا۔“ یہ بھی سنا سے آہستہ سے سنا کروہ سیدھا ہوا اور مسکراہٹ دوبارہ سے لیوں پہ طاری کئے آگے بڑھ گیا۔ سعدی گہری سانس لے کر رہ گیا۔ (واقعی ویکم ہوم!)

وہ اپنے کمرے میں آیا تو زمر کھٹ کے لئے تیار کھڑی تھی۔ اسے نظر انداز کئے آئینے کے سامنے کھڑی لپ اسٹک لگاتی رہی۔

”آہم!“ وہ ہلکا سا کھٹکھٹا۔ ”اس ناشتے کا کیا کیا؟“

زمر نے آواز کے ساتھ لپ اسٹک بند کی اور اس کی طرف کھوی۔

”تم فجر پڑھنے گئے تھے یا تراویح؟“

”کیوں میری عبادتوں کو نظر لگاتی ہو؟ استغفر اللہ!“ اس نے کان کی لو کو چھوا۔

”کہاں گئے تھے؟“ وہ چبھتی نظریں اس پہ جمائے تفتیشی انداز میں پوچھ رہی تھی۔

”تیسری بیوی کے پاس!“ زمر کے تاثرات بگڑے۔ ماتھے کی تیوریاں بڑھ گئیں۔

”تو پھر ادھر ہی رہتے نا۔“ وہ طنز یہ سر جھلا کر بولی تھی۔ وہ قدم قدم چلتا اس کے قریب آیا۔

”میں اس امر کو یقینی بنانے گیا تھا کہ وہ دوبارہ میرے اور تمہارے کسی ناشتے کسی کھانے کے درمیان نہ آئے۔“ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر اتنے اعتماد اور مان سے بولا کہ زمر کے تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ بھوری آنکھوں میں امید سی چمکی۔

”وہ اب کبھی بھی کوئی مسئلہ نہیں کرے گی۔ مجھ پہ اعتبار کرو۔“ اس کی آنکھوں کا بھروسہ۔۔۔ اور مان۔۔۔ وہ پکھل گئی۔ اور پھر ہلکا سا

مسکرائی۔ ”وہ گئی ہے تو کوئی اور آجائے گی۔ تم بھی تو عادت سے مجبور ہو۔“

”آپ کی ان ہی اداؤں کو دیکھ کر دل چاہتا ہے کہ۔۔۔ بندہ جیل سے کبھی واپس ہی نہ آیا ہوتا۔“ وہ خفگی سے کہتا پلٹ گیا تو وہ بے اختیار

ہنس دی۔

(دو نمبر آدمی۔۔۔) وہ کمرے سے نکل گیا تو زمر نے ڈائننگ ٹیبل کی اوپری دراز کھولی اور پیچھے ہاتھ ڈال کر کچھ باہر نکالا۔ سیاہ مٹلیں ڈبیا

جس پز مانوں کی گرد پڑی تھی۔ زمر نے گرد جھاڑی اور اسے کھولا۔ اندر رکھی دکتی ہوئی ہیرے کی لوٹنگ ہر گرد اور آلائش سے پاک تھی۔ وہ

مسکرا دی۔ اس نے لوٹنگ کی ڈبی پرس میں ڈالی اور بال برش کرنے لگی۔ (فارس غازی جب آج یا کل اسے یہ لوٹنگ پہنے دیکھے گا تو اس کے

کیا تاثرات ہوں گے؟ اف۔ وہ اس کی وہ شکل دیکھنے کے لئے بے تاب تھی۔)

زمرہا برآئی تو فارس سمیت باقی سب ناشتہ کر رہے تھے۔ اسے پہلے دو الیمنا تھی سو کچن میں آئی۔ گول میز پر حسین اکیلی چائے پی رہی تھی۔
”خہ۔ تم ادھر؟“ حسین نے چہرہ اٹھا کر اسے دیکھا۔

”جی میں ادھر ہی ہوں۔ اسی گھر میں۔ لیکن کوئی بات نہیں اگر آپ مجھے بھول گئیں۔ کوئی بات نہیں اگر آپ کو میری کمی محسوس نہیں ہوئی۔
خہ تو ہمیشہ سے بس منظر میں ہوتی ہے۔ یہ اتنے مہینے تو وہ آپ کی نظر میں سعدی یوسف کے sad reminder کے طور پر موجود
تھی۔ اس کے lesser version کے طور پر۔ مگر اب وہ آگیا ہے تو میں بھی اپنی پرانی جگہ پر واپس آگئی ہوں۔ رہیں آپ تو آپ کے
لئے ہمیشہ سعدی سب کچھ تھا۔ صرف سعدی۔ سو آپ ناشتہ انجوائے کریں اور میرے لئے گٹھلی فیمل نہ کریں۔ مجھے اپنی بد صورت سچائیوں اور
اپنے اندر موجود شیاطین کے ساتھ رہنا آگیا ہے!“ وہ چائے کا گلاس اٹھا کر سادگی سے کہتی اس کے ساتھ سے نکل کر باہر چلی گئی۔ زمر
بالکل خاموش سی ہو گئی تھی۔ اور کچھ فضا بھی۔ اسے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ گھر کے ایک فرد کے راضی ہونے تک دوسرا کیوں ناراض ہو جاتا تھا!

☆☆☆☆☆☆☆☆

اب مدد سال کی مہلت نہیں ملنے والی

آگئے اب تو شب و روز عذابوں والے

ہارون عبید اپنے آفس میں کنٹرول چیمبر پہ بیٹھے چائے کا کھونٹ پیتے ہوئے چند کاغذات کا مطالعہ کر رہے تھے۔ عینک ناک پہ دھری تھی
اور انہماک قابل دید تھا۔ موبائل بار بار بج رہا تھا۔ بالآخر انہوں نے اسے اٹھایا لیا۔ ”بولو بیٹا۔“

”آپ نے فارس سے کیا کہا ہے؟“ وہ رو رہی تھی۔ انہوں نے گہری سانس لیتے ہوئے عینک اتاری۔

”جو امین نے مجھے کہا تھا کہنے کو۔ یہی کہ تم ہسپتال اس لیے ہو کہ... خیر میں جانتا ہوں امین غلط بیانی کر رہا تھا اور اگر تمہارے توجہ
حاصل کرنے والے کام ختم ہو گئے ہوں تو گھر واپس چلی جاؤ۔ کسی کو معلوم ہوا تو نیا تماشا بنے گا۔“ وہ سادہ اور مصروف انداز میں کہہ رہے
تھے۔

”ہا ہا آپ ہمیشہ میرے ساتھ ہی کرتے ہیں۔“ وہ روتے ہوئے چلائی تھی۔ ”آپ نے کبھی مجھے کچھ نہیں دیا۔ ہمیشہ میرا راستہ روکا۔
ہمیشہ مجھے ہرٹ کیا۔ آئی ہیٹ یو ہا ہا۔ آئی ہیٹ یو...“ اور روتے روتے اس نے کال کاٹ دی تھی۔

ہارون کافون پکڑے ہاتھ کان سے لگا رہا تھا، گویا وہ شل سے ہو گئے تھے۔ ساکت۔ متعجب۔ پھر سر جھٹک کر وہ دوبارہ سے کام کرنے
لگے مگر چہرے سے شدید ڈسٹرب لگ رہے تھے۔ بار بار فون اٹھاتے پھر رکھ دیتے۔

”تم اس حد تک گر سکتے ہو میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔“ دروازہ دھاڑ سے کھلا اور جواہرات کاردار تیز تیز چلتی اندر آتی دکھائی دی۔ ہارون
نے اکتا کر نظریں اٹھائیں۔ وہ میروں اور سفید لباس میں گہرے میک اور جیولری پہنے ایک طرف جتنی بنی سنوری ہوئی تھی دوسری جانب
آنکھوں میں اتنی ہی سرخی تھی۔ وہ اکتا سے گئے۔

”بیٹھ جاؤ جواہرات۔ آج کل تم لوگ کسی کو دھمکانے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔“

”میں یہاں بیٹھنے نہیں آئی۔“ میز پر دونوں ہاتھ رکھے جھک کر وہ غرائی۔ ”تم لوگوں نے میری ویڈیو بنائی۔ اور اب تمہاری بیٹی اس ویڈیو کو استعمال کرنے کی دھمکی دے کر گئی ہے مجھے۔ میں نے تم پر مہروسہ کر کے تمہیں ایک کام کہا تھا اور فصیح نے اسے ریکارڈ کر لیا۔“

ہارون عبید تل سے پیچھے ہو کر بیٹھے۔ وہ عمر اور تجربے کے اس دور سے نکل چکے تھے جہاں ”کیا؟ کون سی ویڈیو؟ مجھے نہیں معلوم“ جیسے الفاظ فوراً حیران ہو کر بولے جاتے ہوں۔ انہوں نے جواہرات کے الفاظ کو ذہن میں ترتیب دیا اور ساری تصویر واضح ہو گئی۔

”اور میری بیٹی نے یقیناً یہ بھی بتایا ہوگا کہ کس صورت میں وہ اس ویڈیو کو استعمال نہیں کرے گی۔“

”ہاں بتایا تھا۔ ڈونٹ ٹیل می کہ تم نہیں جانتے۔ لیکن یاد رکھنا میں ہاشم سے کچھ نہیں کہوں گی۔ اس نے اپنی مرضی سے آبی کو پر پوز کیا ہے۔“ (میز پر رکھی ہارون کی مٹھیاں زور سے بھینچ گئیں۔ ماتھے پر ہلکا سا دھچکا۔) ”اور میرے کہنے سے وہ نہیں رکے گا۔ اس لئے اپنی بیٹی کو سمجھاؤ، شادی سے انکار کرنا ہے تو خود کرے اور اس ویڈیو کو ضائع کر دو ہارون۔ ورنہ جوش کروں گی۔۔۔“

”کیا کرو گی تم؟“ وہ کرسی دھکیل کر اٹھ کھڑے ہوئے۔ آنکھوں میں غصہ لئے جواہرات کو دیکھا۔ ”وہ ویڈیو ضائع نہیں ہوگی۔ اپنے بیٹے کو سمجھا دو کہ وہ میری بیٹی سے دور رہے۔ ورنہ میں اس کو تمہاری آنکھوں کے سامنے تباہ کر دوں گا۔ ناؤ گیٹ آؤٹ۔ آجاتے ہیں دھمکیاں دینے۔ پہلے اپنے مسئلے سلجھاؤ۔“ جواہرات برہم سی واپس مڑ گئی اور جب تک وہ باہر نکلی ہارون بلند آواز میں بولتے رہے۔

کرسی پر واپس گرتے ہوئے انہوں نے بے اختیار رائی کی ناٹ ڈھیلی کی۔ وہ شدید متشکر نظر آنے لگے تھے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

زندہ رہنے کی تمنا ہو تو ہو جاتے ہیں

فاخاؤں کے بھی کردار عقابوں والے

اس سنہری دو پہر حنین اپنے کمرے میں لیپ ٹاپ کے سامنے بیٹھی مسکرا کر اسکرین کو دیکھ رہی تھی۔

”کاپی نہیں ہو پارہا تو کیا ہوا؟ میموری کارڈ تو میرے پاس ہے۔“ میموری کارڈ کی فائلز کاپی نہیں ہوتی تھیں اس نے بہت کوشش کر کے دیکھ لی تھی۔ اس نے سلاٹ سے کارڈ نکالا پھر ایک ننھی سی پلاسٹک کی ڈبی (جس کو اپنے کچھ میموری کارڈز سے اس نے خالی کر لیا تھا) میں اسے ڈالا۔ اپنی الماری کھولی۔ لاک والے دراز میں اسے رکھ کر متغفل کیا اور چابی جوتوں کے خانے میں پیچھے پیچھے کر کے چھپا دی۔ پھر مسکرا کر واپس لیپ ٹاپ پر آ بیٹھی۔ ان باکس کھولا۔ سیو سعدی یوسف کا پیغام ابھی تک ان باکس میں موجود تھا جس میں اصرار اس نے ایڈمن بننے کی درخواست دی تھی۔

مسکراتے ہوئے حنین نے پیغام ٹائپ کیا۔ ”یہ ہے میرا نمبر۔ مجھے کال کریں پلیز اصرار۔ مجھے سلطان بگش کے بارے میں بات کرنی ہے!“ پیغام بھیج کر وہ کرسی پر ٹپک لگائے مزے سے بیٹھ گئی۔ دو سیکنڈ بعد ہی seen لکھا آ گیا۔

اگر آفس کی راہداری میں دو افراد کے ساتھ چلتا جا رہا تھا اور کچھ بول بھی رہا تھا جب موہاٹل بجا۔ چونکہ ہاتھ میں ہی تھا اس لئے اس نے بات جاری رکھتے ہوئے اسکرین کو چھوا۔ پیغام پڑھ کر اس کی زبان رکی۔ چہرہ فق ہوا۔ ان لوگوں سے معذرت کر کے وہ تیزی سے اپنے آفس کی طرف واپس آیا اور فون کان سے لگایا۔ حنین نے تیسری گھنٹی پہ فون اٹھالیا تھا۔

”کیسے ہیں آپ کاردارز کے میڈیا مینیجر، ایچ کنسلٹنٹ اہر شفیق صاحب یا مجھے یوں کہنا چاہیے کہ.... سل.... طان....“ وقفہ دیا تو وہ جلدی سے بولا۔

”مفتول گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ بتائیے کیا مسئلہ ہے؟“ نائی ڈھیلی کرتے ہوئے وہ پریشانی سے کہہ رہا تھا۔

”مجھے یہ پوچھنا تھا کہ کیا کاردارز ابھی تک ہماری کالٹر یکارڈ کر رہے ہیں؟ وہ معصومیت سے بولی۔

”ایسا کچھ نہیں ہے بچے۔ کوئی آپ کی کالٹر یکارڈ نہیں کر رہا۔“

”اچھا۔ یعنی پھر ہم تسلی سے بات کر سکتے ہیں۔ میں ایک صاحب کے بارے میں بات کرنا چاہتی ہوں۔ ان کا نام سلطان تھا....“

”حنین، پلیز!“ اس نے پریشانی آستین سے پونچھی۔ سفید چہرہ لئے وہ مضطرب سافون کان سے لگائے آفس میں ٹہل رہا تھا۔

”نہیں اہر شفیق۔ پلیز تو میں بولوں گی اب۔ ایک گھنٹے کے اندر اندر ہمارے تمام فونز اور کمپیوٹرز کی مانیٹرنگ ختم کر دی جانی چاہیے ورنہ میں اپنے پی ٹی سی ایل سے اپنی پھپھو کو کال کروں گی اور ان کو وہ دلچسپ کہانی سناؤں گی، سلطان صاحب والی اور میں روز بھی کروں گی۔

روز اپنے ایک دوستے دار کو کال کر کے ان کو وہ کہانی سناؤں گی۔ اب ہماری کالٹر یکارڈ کرنی ہیں یا نہیں یہ فیصلہ آپ کا ہے۔ ہائی!“ مسکرا کر کال کاٹی اور اہر فون رکھ کر تیزی سے باہر بھاگا۔ لفٹ میں سوار وہ نچلے فلور تک گیا اور بھاگتے ہوئے راہداری عبور کی۔ ایک آفس کا دروازہ کھولا اور اندر بیٹھے کانوں سے ہیڈ فون لگائے غصے کو ”اٹھو۔ باہر جاؤ“ کہہ کر اسے کالر سے اٹھا کر کھڑا کیا اور اس کی جگہ پہ بیٹھا۔

”باہر جاؤ!“ وہ حیران پریشان سا جگہ سے نہ ہلاتا اہر دھاڑا۔ وہ فوراً ہر لپکا۔ اب اہر تیزی سے کی بورڈ کے مٹن دبا رہا تھا۔ اس کی پریشانی سخت سردی میں بھی پسینے سے تر ہو رہی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وہ وقت آگیا ہے کہ ساحل کو چھوڑ کر

گہرے سمندروں میں اتر جانا چاہیے

ہاشم کے آفس میں باوجود سردی کے کسی بیٹر کی ضرورت نہ تھی۔ ماحول خاصا گرم ہو رہا تھا۔ ہاشم نے برے موڈ کے ساتھ فون دکھا اور سامنے بیٹھی جواہرات کو دیکھا۔

”ایس ایچ او کا تبادلہ ہو گیا ہے۔“ وہ کچھ سوچتے ہوئے بولا۔

”اور یہ یقیناً صاحبزادی صاحبہ نے کروایا ہوگا۔“ جواہرات فکر مندی سے آگے ہوئی۔ وہ اسی صبح والے لباس میں تھی اور بے حد مضطرب

لگد ہی تھی۔ گہرے میک اپ کے باوجود وہ بوڑھی لگنے لگی تھی۔

”کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نو شیرواں کو کوئی گرفتار نہیں کر سکتا۔“ ہاشم نے ناک سے کھٹی اڑائی۔

”تم اس کی ضمانت قبل از گرفتاری کروالو پھر بھی۔“

”ممی کیا ہو گیا ہے؟ یہ non-bailable offence ہے۔ ضمانت نہیں ہو سکتی۔“

”ہو سکتی ہے۔ تم نے رانا برکت والے کیس میں کروائی تھی نا۔“

”ممی وہ غیر معمولی حالات تھے وہاں بہت سی جائز وجوہات تھیں۔ یہاں نہ ہو سکتی ہے نہ اس چکر میں پڑنے کی ضرورت ہے۔ آپ بے

بے فکر ہیں، کوئی شیر و گو گرفتار نہیں کرے گا۔“ ہاشم نے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر پورے ڈھوک سے کہا۔ جواہرات نے مضطرب سا پہلو

بدلا۔

”وہ تب سے کمرے میں بند ہے۔ ہاشم تم اس کی فکر کرو۔ فی الحال ہم کتنے کرائسز میں ہیں۔“ ہاشم نے چونک کر اسے دیکھا۔

”کیا مطلب؟ میں اس کی فکر کروں؟ کرتو رہا ہوں۔ میں ہی تو کر رہا ہوں۔ مگر آپ کے یہ الفاظ کہاں سے آرہے ہیں؟“ اس نے

ایک تیز گہری نظر ماں پڑائی۔ جواہرات نے چائے کا کپ آہستہ سے پرچ میں رکھا اور الفاظ ڈھونڈے۔

”آبی والے معاملے کو کچھ عرصے کے لئے ملتوی کر کے....“

”ایک منٹ ممی!“ اس نے سختی سے ہاتھ اٹھا کر اسے روکا۔ جواہرات کی سانس تک اٹک گئی۔ ”میں نے اس کو پر پوز اس لئے نہیں کیا تھا

کیونکہ آپ مجھے بار بار ترغیب دلاتی تھیں۔ میں نے یہ فیصلہ اپنی وجہ سے کیا تھا۔ میری بھی ایک زندگی ہے جسے میں آپ لوگوں کی غلطیاں

درست کرنے میں ختم نہیں کر سکتا۔ وہ معاملہ جہاں ہے وہیں رہے گا۔ اس کے بارے میں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔“

جواہرات نے آہستگی سے اثبات میں سر ہلایا، البتہ اس کی رنگت پھیلنے پر چکی تھی۔ وہ بے حد شکست خوردہ نظر آرہی تھی۔

وہ پرس اٹھائے آفس سے باہر نکلی تو اصرار چلا آ رہا تھا۔ وہ اس کے ساتھ سے گزرنے لگی تو اصرار نے قریب ہو کر سرگوشی کی۔

”مسز کاردار میں یوسفر کے فون ٹیپ ہٹوا رہا ہوں۔“ جواہرات نے چونک کر اسے دیکھا پھر آنکھوں میں غصہ در آیا۔

”یہ ہر کوئی اپنی من مانی کب سے کرنے لگا ہے تم ہاشم سے پوچھو بغیر....“

”مسز کاردار!“ وہ نرمی سے سرگوشی میں بولا۔ ”وہ لڑکا سجدی.... وہ کال کر کے کسی سے خاور کی بات کر رہا تھا۔ خاور کو پھنسانے کی۔ آپ کا

نام لے رہا تھا۔ میں اسی لئے ٹیپ ہٹوا رہا ہوں، بے فکر ہیں میں آپ کا وفادار ہوں۔“ سمجھانے والے انداز میں وہ بولا تو جواہرات گہری

سانس لے کر رہ گئی۔ رنگت مزید پھیلنے لگی۔ (ہر طرف سے گھیرا تنگ ہو رہا تھا۔ ہر شخص نا تم بم بنا تنگ تنگ کر رہا تھا۔)

”ٹھیک ہے تم نے درست کیا۔ ویسے بھی اب کال ٹپنگ کی ضرورت نہیں رہی ہے۔“ وہ تھکے تھکے سے انداز میں کہہ رہی تھی۔ اصرار

نے غور سے اسے دیکھا۔

”مسز کاردار پریشان مت ہوں۔ میں آپ کے ساتھ ہوں۔“

راہداری میں ہار یک ہیل سے چلنے کی آواز آئی تو وہ دونوں جوقدرے الگ تھلگ کھڑے تھے چونک کر دیکھنے لگے۔ سامنے سے شہرین چلی آرہی تھی۔ رنگ برنگے کپڑوں میں ملبوس بالوں کو لئے سیدھے فیشن کے مطابق ہاندھے وہ ان کو نظر انداز کر کے ہاشم کے آفس کی طرف بڑھ گئی۔ جواہرات کی چمکتی نظروں نے دور تک اس کا تعاقب کیا تھا۔

”اھر... مجھے خاور سے نجات چاہیے۔“ وہ بے بسی سے دبی دبی آواز میں کہہ رہی تھی۔ ”ہاشم کہہ رہا تھا اس نے کال کی ہے اس کو۔ ہمیں کچھ کرنا ہوگا اھر!“

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں

لوگ معمار کو جن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

شام کانٹیلوں اندھیرا ہر مل گہرا ہوتا جا رہا تھا۔ کالونی کے گھروں کے پورچ اور گیٹ کی بتیاں جلنے لگی تھیں۔ مغرب کی صدا بلند ہو رہی تھی۔ پرندے گھروں کو لوٹ رہے تھے۔ ایسے میں فارس غازی کالونی کی مسجد میں موجود تھا۔ سب مرر کی چوکی پہ بیٹھا وہ جھک کر قل سے وضو کر رہا تھا۔ پانی اس کے کانوں کی لوار تھوڑی سے ٹپک رہا تھا اور نظریں جھکی ہوئی تھیں۔ پاؤں دھو کر وہ سیدھا کھڑا ہوا پھر سویٹر کے آستین برادر کرتا صحن کی طرف بڑھ گیا۔

مسجد دھیرے دھیرے نمازیوں سے بھر رہی تھی۔ اسے پہلی صف میں جگہ نہیں مل سکی شاید اس نے کوشش ہی نہیں کی۔ ابھی اتنی جلدی اتنے آگے کھڑے ہونے کی ہمت نہ تھی۔ تیسری صف میں وہ دو نمازیوں کے درمیان کھڑا ہو گیا۔ پیر سے پیر ملا لیا۔ اگر دو موجود لوگوں کی اکثریت کو وہ نہیں جانتا تھا۔ علاقہ نیا تھا ابھی جان پہچان میں وقت لگتا تھا۔ اس اجنبی جھوم میں وہ تھا تھا۔ لوگ بولتے باتیں کرتے، صفیں برابر کر رہے تھے۔ وہ بھی سر جھکائے کھڑا رہا۔ امام صاحب نے تکبیر تحریر پر ہی تو اس نے کانوں تک ہاتھ اٹھاتے اللہ اکبر کہتے بازو سینے پہ باندھے۔ اب وہ قدرے پرسکون انداز میں عربی کلمات پڑھنے لگا تھا۔ دھیرے دھیرے بے چین دل کی قرار آرہا تھا۔

سلام پھر کرجب ہر شخص کو جانے کی جلدی تھی وہ سر جھکائے دوزانو وہیں کتنی ہی دیر بیٹھا رہا۔

”میں اچھا آدمی نہیں ہوں، مانتا ہوں۔“ سر جھکائے وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔

”میرے ارادے برے تھے یہ بھی مانتا ہوں۔ میں خاور کو قتل کرنا چاہتا تھا اس نے میرے بے گناہ بھائی اور معصوم بیوی کو مارا تھا۔ میں ہاشم اور جواہرات میں سے کسی ایک... اس ایک کو قتل کرنا چاہتا تھا جس نے اس قتال کا حکم دیا تھا۔ اسی لئے میں کہتا تھا مرے کہ ہم الگ ہو جائیں گے مگر اب ایسا نہیں ہوگا۔ میں خاور کا فیصلہ اللہ آپ پر چھوڑتا ہوں۔ نہ میں اس کے پیچھے جاؤں گا۔ نہ اس کے خلاف کچھ کروں گا۔ رہا ہاشم تو میں اس کی جان نہیں لوں گا۔ خیر آپ جانتے ہیں کیا کروں گا اس کے ساتھ مگر اب... میں کسی کی جان نہیں لینا چاہتا۔“

انصاف چاہیے مجھے۔ عدالت نہیں دے گی جانتا ہوں، خود لینا پڑے گا، مانتا ہوں۔ مگر ہاں اب... اب میں اس سے الگ نہیں ہونا چاہتا۔
اب میں خوش ہوں۔ اب میں ٹھیک ہوں۔ اب روشنی نظر آنے لگی ہے۔ اب لگتا ہے کہ میرا ٹوٹا ہوا دل جڑ جائے گا۔ محبت کتنی محبت سے
heal کر دیتی ہے ہمیں اے اللہ! سر جھکائے چہرے پہ ہاتھ پھیر کر وہ اٹھا تو نمازیوں کا ہجوم تڑپا ہوا چکا تھا۔ وہ چپ چاپ مسجد سے نکل
آیا۔ جوتے پہنا اور ٹھنڈی خوشگوار ہوا میں چلتا ہوا گھر کا قاصد عبور کرنے لگا۔ اس کا چہرہ پہلے سے پرسکون اور مطمئن لگتا تھا۔
اس کے جو گزر میں مقید ہر تار کول کی سڑک عبور کر رہے تھے۔ تیز تیز... اور شاید گزرے برسوں کا قاصد بھی طے کر رہے تھے۔ نیلگوں
اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا۔

تارے آسمان پہ نمودار ہونے لگے تھے... ٹھنڈے بیٹھے تارے....

وہ دونوں سنیما کے ہال میں موجود تھے۔ اندھیر کر سیوں پہ پیچھے کوٹیک لگائے وہ کان کی لومسلٹاں لگا کر اسکرین پہ جمائے ہوئے تھے۔
گاہے بگا ہے ساتھ بیٹھی زرتا شہ کو بھی دیکھ لیتا جو بالوں کو ہینر بینڈ میں مقید کیے ہاتھ میں پکڑے nachos وقفے وقفے سے کھاتی، انہماک
سے اسکرین کو دیکھ ہی تھی۔

”یہ مر جائے گا۔“ کچھ دیر بعد وہ بے چینی سے بولا۔ فلم اسے بور کر رہی تھی۔ زرتا شہ نے چونک کر اسے دیکھا۔
”آپ نے دیکھ کھی ہے پہلے؟“ وہ ناراض ہوئی تھی۔

”نہیں یار۔ صاف پتہ چل رہا ہے۔ اچھا اب ایسی شکل مت بناؤ۔ اسے دیکھو....“ زرتا شہ نے نگلی سے سر جھٹک کر چہرہ واپس موڑا تو
وہ گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

چند لمبے بعد انٹر میشن کا نشان ابھرا اور ہال کی بتیاں جل اٹھیں۔ لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ وہ دونوں وہیں بیٹھے رہے۔ تین چار
لڑکوں کا گروہ ان کی قطار میں آگے بڑھتا ان تک آ رہا تھا، گویا اب ان کے سامنے سے ٹک سی جگہ سے گزر کر جائے گا۔ وہ فارس کی
وائیں طرف سے آرہے تھے، سو فارس نے جو گزر لیے کر کے خلی قطار کی نشست پر رکھ دیے اور سینے پہ بازو لپیٹے، قدرے نیم دراز ہو گیا۔
لڑکے رک گئے۔ جان گئے کہ وہ نہیں چاہتا وہ اس کی بیوی کے سامنے سے گزر کر جائیں۔ وہ واپس مڑ گئے۔
”آپ کو میری بات یاد ہے! مجھ سے نہیں لڑیں گے۔ میرے لئے لڑیں گے۔“ وہ مسکرا کر اس کو دیکھتے ہوئے بولی۔ اس کی آنکھیں چمک
رہی تھیں۔

فارس نے ہلکے سے کندھے اچکائے۔ ”لڑتا تو ہوں تم سے۔“

”جانتی ہوں مگر اس دن آپ نے روبینہ آنٹی کے سامنے میری حمایت کی کہ زرتا شہ نے ایسی کوئی بات نہیں کہی تھی، حالانکہ میں نے کہی
تھی۔“ وہ میکے میں کوئی بات سے بات نکلنے والے لایٹ شو کا تذکرہ کرنے لگی۔

”مجھے پتہ ہے تم نے کہی تھی اور تمہیں نہیں کہنی چاہیے تھی۔ زرتا شہ ہر وقت دوسروں کے معاملات پہ کمنٹس نہیں دیتے۔ اور فیکسٹ اور

فون کا لڑپو یہ کام کبھی نہیں کرتے۔ فونز پہ ہاتھ صرف بگڑتی ہیں کیونکہ پوری سمجھ نہیں آتی۔ لیکن جب کبھی تم خاندان میں کسی کے ہارے میں کوئی بات کیا کرو تو اس کو own کیا کرو اس کے لئے لڑا کرو اس پہ ڈٹ جایا کرو۔ کسی خالہ پھپھی یا بھابھی کے ڈر سے مکر نہ جایا کرو کہ میں نے کسی کو نہیں بتایا۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا وغیرہ۔ بات کو اس کے گھر پہنچایا کرو۔“

”مانا کہ میری غلطی تھی مگر آپ نے ان کے سامنے میری حمایت کی تھی مجھے اچھا لگا تھا۔“ وہ نرم مسکراہٹ کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس نے پھر ہلکے سے کندھے اچکائے۔

”تم غلط کرو گی یا صحیح میں دنیا کے سامنے ظاہر ہے تمہیں ہی سپورٹ کروں گا۔ اگر آپ اپنے گھر کی لڑکیوں کو ان کی غلطیوں کے لئے معاف کر کے ان کو سپورٹ نہیں کر سکتے ان کا ہاتھ تھام کر ان کو ان کے پورے قد کے ساتھ کھڑا نہیں کر سکتے تو آپ کیسے مرد ہوئے! انسان تو بہت سے ہوتے ہیں۔ مرد کوئی کوئی ہوتا ہے۔“

”بس اتنا بتا دیں کہ یہ قلم والا مرد مرے گا تو نہیں؟“ وہ مسکراہٹ دہا کر بولی۔

”میں اول تو اسے مرد مانتا نہیں ہوں، دوم ہاں یہ مر جائے گا۔ نہیں میں نے یہ قلم نہیں دیکھ کھی۔ میں نے صرف ریو میں ساری کہانی صبح پڑھ لی تھی۔“ وہ یونہی نیم دراز ٹیک لگائے مسکرا کر بتا رہا تھا۔

”تاکہ آپ میری قلم خراب کر سکیں!“ اس کی آنکھوں میں پھر سے ناراضی ابھری۔

”مجھے ایک قدم آگے رہنا اچھا لگتا ہے زرتا شہ!“

مغرب پوری طرح ڈھل چکی تھی۔ اس کے جو گز سڑک کو گویا اپنے نیچے لیٹتے تیز تیز فاصلہ عبور کر رہے تھے۔ سبز بیلوں سے ڈھکا بنگلہ سامنے تھا۔ وہ گہری سانس لے کر ماضی کی یادوں کو ذہن سے جھٹکتا اندر داخل ہوا۔

لاؤنج میں وہی لوگ تھے جو روز ہوتے تھے۔ مگر آج لگتا تھا سب کے چہروں پہ مسکراہٹیں ہیں۔ راہداری سے گزرتے وہ کچن کے کھلے دروازے میں ذرا دیر کو ٹھہرا۔ سعدی سلیب کے ساتھ کھڑا تھا اور سر جھکائے مسکرا کر سامنے کرسی پہ بیٹھی زمر کو سن رہا تھا جو دھیرے دھیرے بتا رہی تھی۔۔۔ ”پھر ہم نے فارس کے کیس کے دنوں میں۔۔۔“

پرانی کتھائیں۔۔۔ طویل قصے زمر کی اس کی طرف پشت تھی۔ سعدی نے بھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ ایک ٹائپ کو ٹھہرا پھر اسے

آواز دی۔

”سعدی!“ سعدی نے چونک کر سر اٹھایا۔ زمر نے بھی گردن موڑی۔ (فارس کو دیکھ کر اسے پرس میں رکھی لوگ یاد آئی۔ اوہ ابھی تک نہیں پہنی۔ اپنی بھول پہ افسوس ہوا۔)

”اپنا پاپ سپورٹ مجھے دے دو۔“ اس نے عجلت میں پوچھا گویا زیادہ دیر غفل نہیں ہونا چاہتا تھا۔ مگر غفل کرنے کا بہانہ بھی چاہیے تھا۔

”وہ میں نے ڈسپوز آف کر دیا ہے۔“ سعدی نے سر کو جنبش دے کر تسلی کروائی۔ فارس کے ابرو تو جب سے اکٹھے ہوئے۔

”کیا مطلب ڈسپوز آف کر دیا ہے؟ میں نے کہا تھا میں اسے خود ڈسپوز آف کروں گا۔ وہ صباحت نے اپنا کیرئیر داؤ پہ لگا کر تمہارے لئے بنوایا تھا۔ تمہیں یقین ہے وہ کسی کے ہاتھ نہیں لگے گا۔“ اس نے فکر مندی سے پوچھا تھا۔

”اس کے اتنے ٹکڑے کیسے تھے کہ اب وہ نہیں ملے گا کسی کو۔ فکر نہ کریں!“ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر تسلی دی۔

”مگر....“

”فارس۔ وہ کہہ رہا ہے تو اس پہ بھروسہ رکھو!“

زمر کی بات پہ اس نے ”اچھا جی!“ کہہ کر سر کو خم دیا اور برے موڈ کے ساتھ آگے بڑھ گیا۔ وہ دونوں پھر سے ہاتھوں میں لگ گئے تھے۔

”آپ اکیلے نہیں ہیں۔“ وہ قدم آگے بڑھا تھا کہ سیم کے کمرے کے دروازے پہ کھڑی حسین نے پکارا۔ وہ رکا۔ غور سے اسے دیکھا۔

”اگر تم سمجھتی ہو کہ میں جیلس ہو رہا ہوں تو....“

”میں سمجھتی نہیں ہوں، مجھے یقین ہے۔ خیر ہے۔ ہوتا ہے ایسے۔“ الفاظ کے برعکس اس کا لہجہ شگفتہ نہ تھا۔ چہرے پہ عجیب ویرانی تھی۔ کہہ کر وہ پلٹ گئی اور سیم کے بیڈ پہ آ بیٹھی۔ (وہ ٹیوشن جاتا تھا اس وقت۔) اداس اور ویران۔ یکا یک دروازہ بند ہو کر لاک ہونے کی آواز آئی تو حسہ نے چونک کر سر اٹھایا۔

فارس دروازہ مقفل کر کے کرسی لے کر اس کے سامنے آ بیٹھا اور آگے ہو کر غور سے اسے دیکھا۔ ”حسین، کیا مسئلہ ہے؟ سیم نے مجھے نہیں بتایا۔ مگر تمہاری اور سعدی کی کیا لڑائی چل رہی ہے؟“

ڈھیلی سی فرنجی چوٹی بنائے کٹے بال ماتھے پہ بکھیرے زرد چہرے والی حسین کی آنکھیں ڈبڈبائیں۔

”آپ تو ہمیشہ دو قدم آگے رہتے ہیں، آپ کو ابھی تک کسی نے نہیں بتایا؟“

”کیا؟ مجھے واقعی نہیں پتہ!“ وہ ٹھٹھکا تھا۔ حسہ بھیگی آنکھوں سے اسے دیکھتی رہی۔

”وہ آپ کو بتا دے گا۔ بھائی۔ وہ بتا دے گا اور آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔“ فارس چند ٹاپے بغور اس کی آنکھوں کو دیکھتا رہا۔

”کیا کیا ہے تم نے؟“ الفاظ ہموار اور پرسکون تھے، مگر سوال قیامت تھا۔

”ایسے ہی قیامت کے دن اور اس سے پہلے قبر میں پوچھا جائے گا نا کہ کیا کیا ہے تم نے حسین۔ کیا کر کے آئی ہو؟ میں کیا کہوں گی؟“

آنسو اس کی آنکھوں سے پھسل پھسل رہے تھے۔

”کسی کو قتل کیا ہے؟“ اس نے سادگی سے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ حسہ کی گردن نفی میں ہلی۔

”پھر ہر چیز ٹھیک ہو سکتی ہے۔ بتاؤ مجھے کیا کیا ہے تم نے؟“ اس نے نرمی سے پوچھتے ہوئے حسہ کے ہاتھ تھامے۔ وہ ٹھنڈے منہ سے

رہے تھے۔ گویا برف کے ٹکڑے ہوں۔ اکیس سال کی دبلی پتلی کمزور اداس سی وہ لڑکی ہلکے ہلکے سے کانپ رہی تھی۔ آنسو مسلسل تھوڑی سے

نیچے لڑھک رہے تھے۔

”آپ مجھ سے نفرت کریں گے۔“

”نہیں کروں گا۔“ اس نے تسلی دی۔

”میں نے ایگزٹ میں چیئنگ کی تھی۔ میں نے اوسی پی صاحب کو...“ وہ ہچکیوں کے درمیان سر جھکائے بتاتی رہی۔ وہ توجہ سے سنتا رہا۔

”کٹھا ختم ہوئی توحنہ نے بھیگا چہرہ اٹھلایا۔“

”حسین!“ وہ گہری سانس لے کر بولا۔ ”انسان زندگی میں بہت کچھ کرتا ہے۔ غلط صحیح اچھے برے کام سب کرتا ہے انسان۔ ہر چیز کو تجربہ

سمجھ لیا کرو۔ ٹھیک ہے تم سے غلطی ہوئی، لیکن تم نے توبہ کر لی نا بات ختم ہو گئی۔“ وہ سوچ سوچ کر بول رہا تھا۔

”اگر شفیق جانتا ہے۔ اس نے ہمارے گیٹ پہ آکر مجھے دھمکی دی تھی!“ فارس ایک دم سیدھا ہو کر بیٹھا، گویا بری طرح چونکا تھا۔ اس نے

یہ کٹھا بھی سنا ڈالی۔

”یہ کب کی بات ہے؟“

”جب آپ سری لنکا تھے“ وہ لب بھنج کر رہ گیا۔ ”خیر میں اس سے لے لوں گا ہر چیز۔ وہ کسی کو نہیں بتائے گا۔“

”وہ آپ کو وہ سارے ثبوت نہیں دے گا۔“

”اس کا تو ہاپ بھی دے گا۔“

حسین چپ ہو گئی۔ ”اس کا ہاپ... خیر کسی اور کے راز کھولنے سے پہلے... ایک اور بات...“ اس نے اب کی بار سر نہیں جھکایا۔ اب سر

اٹھا کر بات کرتی تھی۔ آنکھوں میں دیکھ کر۔ اس کے ہاتھ پہ اپنے کمزور ہاتھوں کی گرفت مضبوط کر کے۔

”میں نے کچھ اور بھی کیا ہے۔ جس کی وجہ سے بھائی مجھ سے ناراض ہے۔“

”اور وہ کیا ہے؟“ وہ بنا پلک جھپکے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

”آپ نے مجھے منع کیا تھا مگر میں بہت اکیلی تھی، مجھے کوئی اپنا دوست نہیں لگتا تھا۔ میں... میں ہاشم بھائی سے فیکسٹ پہ بات کرتی

تھی... میں...“ اسے لگا فارس کے ہاتھ اس کے ہاتھ سے پھسلنے لگے ہیں وہ ہلکا سا چونکا تھا، ڈھیلے اعصاب تن گئے تھے، حسین نے اپنے پسینے

میں ڈوبے ہاتھوں سے اس کے ہاتھ پہ گرفت مضبوط کر دی۔ بس ان ہاتھوں کو وہ نہیں چھوڑ سکتی تھی، وہ نہیں کھو سکتی تھی۔

”آئی ایم سوری... مجھے نہیں پتہ تھا میں کیا کر رہی ہوں... میں ان کو پسند کرنے لگی تھی۔ آئی ایم سوری... میں کبھی ان سے ملنے نہیں

گئی... انہوں نے بلایا تب بھی نہیں... وہ سعدی بھائی کے ساتھ تھے... بھائی کو نارجہ کرنے کے لئے مجھے کال کر رہے تھے، بھائی اسی لئے

خفا ہے مجھ سے۔ میں نہیں گئی مگر کئی ماہ... کئی ماہ میں ان سے بات کرتی رہی... فیکسٹ پہ... ایک دو دفعہ کال پہ... مگر میں ان سے بات کرتی

رہی... مجھ سے غلطی ہو گئی ماموں... میں غلط راستے پہ چلی گئی تھی... میں بہت بری ہوں۔“ وہ اسے دیکھتے ہوئے روتے ہوئے کہہ رہی

تھی۔ آنسو اس کے ہاتھوں پہ بھی گر رہے تھے یا شاید وہ پسینہ تھا مگر وہ ابھی تک مضبوطی سے اس کو تھامے ہوئی تھی۔ وہ بالکل خاموش ہو گیا تھا۔ چپ۔ پھر اس نے نظریں جھکا لیں۔ حسین وحشت سے اسے دیکھنے لگی۔ دل ڈوبنے لگا۔ اور پھر فارس نے آہستہ سے اپنے ہاتھ نکال لئے۔ اس کے گیلے ہاتھ تجارہ گئے۔ وہ شل بیٹھی رہ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کھڑکی میں جا کھڑا ہوا۔ باہر پھلتے اندھیرے کو دیکھتا وہ کچھ سوچ رہا تھا۔ حسین نے اپنے خالی ہاتھ اپنے جی دامن میں رکھ لئے ساری دنیا ویران ہو گئی تھی۔

”تم نے کبھی اسے کہا کہ تم اس کو پسند کرتی ہو؟“ وہ کھڑکی سے باہر دیکھتا پوچھ رہا تھا۔ آواز آہستہ تھی۔ بہت آہستہ۔

”انہیں انداز ہو گا۔ وہ ہاشم کا روار ہیں میں نے....“

”میں نے پوچھا تم نے اسے کہا یا نہیں کہا۔“ وہ اب حد کی طرف گھوما۔ وہ ایک ٹک چہرہ اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔

فارس نے آنکھیں بند کر کے گہری سانس باہر خارج کی اور پھر واپس کرسی کی طرف آیا۔

”سنو حسین!“ وہ سنجیدگی سے اس کے سامنے بیٹھا کہنے لگا تھا۔ ”انسان کا پسندنا پسند پہ اختیار نہیں ہوتا۔ وہ اس کے بعد کیا کرتا ہے اس پر اختیار ہوتا ہے۔ میں نے بھی جیل میں اچھے برے بہت سے کام کیے ہیں۔ اتنی عمر ہو چکی ہے کہ اب میں ایک چھوٹی بچی کو جج نہیں کر سکتا۔ میں اس بات کو دوبارہ ڈسکس بھی نہیں کرنا چاہوں گا۔ مجھے اب صرف اس بات کی پرواہ ہے کہ وہ کورٹ میں کیا پیش کرے گا۔“

”کورٹ؟“ حد نے نا سمجھی سے اسے دیکھا۔ ”کون سا کورٹ؟“

”اگر کوئی ٹرائل ہوا تو وہ تمہیں کورٹ میں بلائے گا اور تمہارے سارے میسج پر پٹ کر کے وہاں پیش کرے گا۔ آئی ایم سوری حد اگر میں کبھی تمہیں یہ یقین نہیں دلا سکا کہ تم اکیلی نہیں ہو، کہ تم مجھ پہ اعتبار کر سکتی ہو۔ لیکن اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں تمہیں جج نہیں کروں گا۔ کوئی بھی چیز میرے دل میں تمہاری محبت کم نہیں کر سکتی۔ اور ابھی میں بھی کچھ بتاؤں گا تمہیں، تاکہ یہ ثابت کر سکوں کہ میں بھی تم پہ اعتبار کرتا ہوں۔ مگر پہلے مجھ پہ پھر وہ کہو اور بتاؤ کہ ان میسج میں کیا تھا؟ تم اس سے کیا بات کرتی تھیں؟“ اس نے دوبارہ سے حد کے ہاتھ تھام لئے تھے اور وہ اس سے پوچھ رہا تھا۔ نہ نرمی سے نہ سختی سے۔ ضبط اور تحمل سے۔ مگر حسین اسے نہیں دیکھ رہی تھی۔ وہ ایک ٹک گم سم سی خلا میں دیکھ رہی تھی۔

عرصے بعد ایک گتھی سلجھ گئی تھی۔ ایک گرہ کھل گئی تھی۔ ایک سرا ہاتھ میں آ گیا تھا۔

وہ سوال قیامت تھا اور جواب بھی قیامت سے کم نہ تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

حشر کے دن کا غلطہ شہر کے بام و در میں تھا
ٹکے ہوئے سوال تھے اگلے ہوئے جواب تھے

اگلے چوبیس گھنٹے کہاں غائب ہوئے، پتہ ہی نہیں چلا۔ ایک دن طلوع ہو کر ڈھل بھی گیا اور چھاتے اندھیرے نے دیکھا، نوشیرواں کاردار اس خوبصورت جنگلے کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہو رہا ہے جو کلب کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ ادھر ادھر ٹولیوں کی صورت بیٹھے لوگ.... ٹہلنے لڑکے لڑکیاں.... سرو کرتے ویٹرز.... ہر کسی نے آنکھ اٹھا کر.... نظر بچا کر اسے دیکھا تھا۔ وہ بڑے دن بعد نہادھو کر تیار سا پرفیوم کی مہک میں بسا، گلاسز آنکھوں پہ چڑھائے، منہ میں جو گم چبانا چلا آرہا تھا۔ بار کا ویٹر کا سٹول کھینچ کر بیٹھا اور سیل فون نکالتے ہوئے بار ٹینڈر کو اپنا آرڈر بتایا۔ سن گلاسز اتار کر گریبان پہانکائیں اور اسکرین پہ انگلی پھیرتا نیوز فیڈ چیک کرنے لگا۔

سرگوشیوں اور اونچی باتوں میں اسے اپنا نام واضح سنائی دے رہا تھا۔ وہ نظر انداز کر کے مشروب کے کھونٹ بھرنے لگا۔ اب وہ نہیں چھے گا۔ نہیں ڈرے گا۔ کون یقین کرے گا کس نے کسی کو مارنا چاہا ہے؟ چند دن میں لوگ بھول بھال جائیں گے۔ دفعتاً اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے آکھڑا ہوا ہے۔ شیر و نظر انداز کیے کھونٹ بھرتا موبائل دیکھتا رہا۔ وہ کسی سے بات کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔ مگر دھیرے دھیرے ایک عجیب سا احساس رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ کلب میں چھاتی غیر معمولی خاموشی۔ جیسے سب سرگوشیوں میں بول رہے ہوں اور پھر چپ ہو گئے ہوں۔

”امریکہ میں ایسے موقعوں پہ مریڈا رائٹس پڑھ کر سنائے جاتے ہیں۔ آفیسر آف لاء کہتا ہے کہ تمہیں خاموش رہنے کا حق ہے، کیونکہ تم جو بھی کہو گے وہ تمہارے خلاف عدالت میں استعمال ہوگا۔“

نوشیرواں کاردار بجلی کی سی تیزی سے گھوما۔ اس کی پشت پہ.... سینے پہ بازو لپیٹے.... وہ کھڑا تھا۔ وہ جس کا آسیب اس زیرِ تعمیر گھر میں بہتے خون سے نکل کر نوشیرواں کے اندر آ بسا تھا۔ وہ آج مجسم صورت اس کے سامنے کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ پاٹ تھا اور آنکھوں میں نیش تھی۔ جیکٹ اور جینز میں ملبوس چھوٹے کٹے بالوں والا لڑکا جس کے منہ پہ زخم کا نشان تھا، اس پہ نظریں گاڑے کہہ رہا تھا۔

”مگر پاکستان میں آرٹیکل تیرہ ہی کافی ہوتا ہے۔ دہرانے کی ضرورت پھر بھی نہیں ہے ہمیں کیونکہ تم خاموشی سے کبھی گرفتاری نہیں دو گے۔“

کسی نے کلب کے لاونج کی سفید بتیاں جلا دی تھیں۔ مدھم دھننیوں والا خوابناک ماحول یکدم جیسے تیز روشنی میں نہا گیا تھا۔ بدھم سفید روشنی نے سب عیاں کر دیا تھا۔ سعدی یوسف کے ساتھ سیاہ وردی والے چند افراد کھڑے تھے۔ نوشیرواں کا رنگ پھیکا پڑا۔ وہ آہستہ سے جگہ سے اٹھا۔

”میں سیکشن 161 سی آر پی سی کے تحت نوشیرواں اور نگریب کاردار کو اپنا حملہ آور اور اغوا کار نامزد کرتا ہوں۔ مجھے آٹھ ماہ محبس بے جا میں رکھنا اور جسمانی و فنی اذیت دینے کا ذمہ دار بھی ہے۔ اور ان کے پاس تمہاری گرفتاری کے وارنٹ ہیں۔“ نوشیرواں نے فوراً موبائل کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر آفیسر نے اپنی چھتری اس کے ہاتھ پہ رکھ دی۔

”تم لوگ مجھے یوں گرفتار نہیں کر سکتے۔ میرے بھائی کو بلاؤ۔“ وہ سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ چلا کر بولا تھا۔ سعدی سینے پہ بازو لپیٹے دو

قدم پیچھے ہٹ گیا۔ ایک سپاہی آگے بڑھا اور نوشیرواں کے ہاتھ تھامنے چاہے مگر اس نے رکھ کر سپاہی کے منہ پہ مکا جڑ دیا۔ ارد گرد قماش جین لڑکے لڑکیوں نے موبائل کیمرے نکال لئے تھے۔ کلک کلک۔ تصاویر اور ویڈیوز بنائی جا رہی تھیں۔ تین سپاہیوں نے اس پہ حملہ کر دیا تھا اور وہ مزاحمت کرتا رہا، چلاتا رہا، گالیاں دیتا رہا، انہوں نے اسے سینے کے بل کاؤنٹر سے لگایا اور ہاتھ پیچھے سے باندھے۔ ایس ایچ او اب اس کو اس کے حقوق پڑھ کر سنار ہاتھ اس کے اوپر لگی دفعات کی تفصیل بتا رہا تھا اور وہ کف اڑاتا غصے سے خود کو چھڑاتا مسلسل چلا رہا تھا۔ ہر زاویے سے لوگ دلچسپی سے ویڈیو بنا رہے تھے۔ پولیس والے اس کو لے کر جا رہے تھے اور سعدی یوسف آخر میں... ان سب کے پیچھے چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتا چل رہا تھا۔ مناظر کی عکس بندی جاری تھی... آوازیں اور شور بڑھتا جا رہا تھا.... باہر اسے پولیس وین میں ڈالا جا رہا تھا۔ سعدی وین سے ذرا فاصلے پہ کھڑا تھا۔ ہاتھ کمر پہ باندھے وہ سوچتی نگاہوں سے وین کو دیکھ رہا تھا جب ایس پی بخت اور چشتی اس کے ساتھ آکھڑا ہوا۔

”آپ کا شکریہ کہ آپ نے مجھے اس موقع پہ آنے دیا۔“ وہ نرمی سے سر کو خم دے کر بولا۔

”سعدی خان میں ان لوگوں سے نہیں ڈرتا۔ ہم اپنے علاقے کے پیر ہیں، گدی نشین ہیں۔ ہمارے ساتھ بہت سے لوگ ہیں۔ صبح عدالت میں پیشی سے پہلے تک نوشیرواں کاردار کا بھائی کیا اس کا باپ بھی قبر سے اٹھ کر آجائے تو اس کو نہیں چھڑا سکتا۔“ پھر اس نے سعدی کے کندھے پہ تھکی دی۔ ”تمہیں انصاف ضرور ملے گا۔ ہر پولیس والا ان کی طرح نہیں ہوتا جن سے تمہارا پہلے پالا پڑا ہے۔ تم بے فکر رہو۔ پولیس اس آدمی کو آج لا کر آپ سے نکلنے نہیں دے گی۔“ وہ اسے تسلی دے رہا تھا اور سعدی اس پہ یقین کرنا چاہتا تھا۔ مگر جانے کیوں اب کسی پہ یقین نہیں آتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

جب ڈوبنا ہی ٹھہرا تو پھر ساحلوں پہ کیوں

اس کے لیے تو جہ بھنور جانا چاہیے

”میرا نام ہے سعدی یوسف۔“ نے وہ تہلکہ نہیں مچایا تھا جو نوشیرواں کاردار کی گرفتاری کی ویڈیو نے مچا دیا۔ چند منٹوں میں وہ ویڈیو نیوز چینلوں پہ نشر ہونے لگی۔ مختلف زاویوں سے لئے گئے واضح شائش جیسے جیسے اسکرین پہ چلتے گئے، کاردار اینڈ سنز کے شیئرز کی مارکیٹ ویلیو گرنے لگی۔ ہاشم کاردار کی پچھتر سے زائد ملکی کمپنیز سے ایک دم سرمایہ کھینچا جانے لگا اور پہلی دفعہ ہاشم کو احساس ہوا کہ پانی سر سے اوپر ہو رہا ہے۔

وہ ہارون عبید کے ساتھ... وکلاء کا ایک وفد لئے... اس وقت تھانے میں موجود تھا... اور نخوت اور غرور سے ٹانگ پہ ٹانگ چڑھا کر بیٹھا تلخی سے ایس پی بخت گیلانی سے مخاطب تھا۔ بحث، دھمکیاں، باتیں، سب گرم ماحول میں بلند آواز میں ہو رہی تھیں۔ سامنے والا بھی اپنے علاقے کا پیر تھا۔ اونچی گدی کا عادی تھا۔ گردن اس کی بھی نہیں جھکتی تھی، صرف نفی میں ہلاتی تھی۔

”اوپر سے دباؤ ہے کاردار صاحب۔ اب میں اس کو نہیں چھوڑ سکتا۔ صبح فیصلہ عدالت میں ہوگا۔“

”ساری زندگی دیکھی ہیں میں نے عدالتیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ویڈیو میں تو اس لڑکے نے ہم دونوں کا نام بھی لیا تھا پھر حتمی ایف

آئی آر میں صرف میرے بھائی کو نامزد کیوں کیا؟“ ان کی بحث جاری تھی۔ ایف آئی آر کے مطابق صرف نوشیرواں کاردار ذمہ دار تھا سعدی کے اوپر کیے گئے تمام مظالم کا۔

باہر سرد لہداری میں وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ دونوں خاموش سے گہری ہوتی رات کو دیکھ رہے تھے۔

”ہم ہاشم اور ہارون عبید کو کیوں نامزد نہیں کر رہے؟“ وہ یہ بات سمجھ نہیں پا رہا تھا۔

”ہاتھ والا پرندہ جھاڑی والے دو پرندوں سے بہتر ہوتا ہے۔ بجائے اس کے کہ وہ تینوں کمزور کیس کی وجہ سے بری ہو جائیں، ہم صرف

نوشیرواں پر فوکس کرتے ہیں۔ اس کے خلاف مضبوط کیس بناتے ہیں۔ اس کو سزا ملی تو ہاشم جیتے جی مر جائے گا۔“

”لیکن وہ پھر بھی آزاد کھوے گا۔“ سعدی نے تلخی سے سر جھٹکا۔ اسی پل سامنے سے دو سپاہی نوشیرواں کو ہتھکڑی لگائے چلے آ رہے تھے

۔ اس کے چہرے پر بے چینی تھی اور آنکھوں میں غصہ۔ سر جھٹک منہ میں کچھ بڑبڑاتے ہوئے وہ چلتا جا رہا تھا، دفعتاً ان دونوں کو ستون کے ساتھ کھڑے دیکھ کر کا۔

”میں سمجھا تھا سبز زمر کہ آپ مختلف ہوں گی۔ مگر آپ سب ایک جیسے ہیں۔“

”تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔“ زمر نے سعدی کے سامنے بازو پھیلا کر گویا دونوں کے درمیان آڑی

بنائی۔

”تم نے مجھ پہ گولیاں چلائی تھیں۔“ سعدی بھی پھر کر غرایا۔

”تم نے مجھے گالی دی تھی!“

”تو گالی سے جواب دیتے نا۔ گولی سے کیوں دیا؟“ وہ اونچی آواز میں بولا تھا۔

”نوشیرواں تم اپنے وکیل کی غیر موجودگی میں ہم سے بات نہیں کر سکتے۔ اسے لے جائیں۔“ وہ تحمل سے سعدی کے سامنے آکھڑی ہوئی

اور سپاہیوں کو ہاتھ کے اشارے سے جانے کا کہا۔ وہ نوشیرواں کو ساتھ لے جانے لگے مگر وہ مزمل کر سرخ چہرے سے اسے دیکھتا، مغلطات بکے جا رہا تھا۔

”میں تم سب کو دیکھ لوں گا۔ عدالت میں تمہارے سب گھر والوں کو گھسیٹوں گا۔ تمہاری بہن کو گھسیٹوں گا۔“ سعدی کی مٹھی پہنچی۔ اس نے

دانت پیسے۔ تنفس تیز ہوا مگر زمر نے نرمی سے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا۔ ”اس کی باتیں مت سنو۔ نظر انداز کرو۔“

”آپ نے سنا نہیں وہ کیا بکواس کر رہا تھا۔“ اس کی رنگت متغیر ہو رہی تھی۔ چہرے پر بے بسی در آئی تھی۔

”جب عدالتوں میں معاملے چلے جاتے ہیں نا سعدی تو پھر یہ تو ہوتا ہے۔ اس سے بھی زیادہ برا ہوگا۔ کیا تم واپس مڑنا چاہتے ہو؟“

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام پر موجود آل ٹائم بیسٹ سیلرز:-



”کبھی نہیں۔“ اس نے پورے عزم سے نفی میں سر ہلایا۔

”گڈ! میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ اس نے نرمی سے اس کا ہاتھ دبا کر کہا۔ سعدی گہرے گہرے سانس لیتا خود کو پرسکون کرنے لگا۔
دور راہداری کے سرے پہ ایس ایچ او کے کمرے کے دروازے پہ ہارون عبید نکلتے دکھائی دیے۔ وہ وہیں رک کر زمر کو دیکھنے لگے۔ زمر نے جواباً سعدی کو دیکھا۔

”تم گاڑی میں بیٹھو میں آتی ہوں۔ جاؤ نا!“ وہ اپنے ذہنی خلفشار سے نہیں نکل پایا تھا، مضطرب الجھا الجھا سا آگے بڑھ گیا۔ تب ہارون قدم قدم چلتے مستون کے قریب اٹھہرے۔ کلف لگی شلوار قمیض میں ملبوس وہ چہرے پہ سوچ کی لکیروں کے باعث غیر مطمئن لگتے تھے۔
”مسز زمر... میں نے آپ سے کہا تھا ہم دوبارہ ملیں گے!“ زمر نے بازو سینے پہ لپیٹ لئے اور تحمل سے ان کو سننے لگی۔ ”آپ مجھے تھکی ہوئی لگ رہی ہیں۔ یہ مسئلے بہت تھکا دینے والے ہوتے ہیں۔“

”بلاشبہ ایسا ہی ہے لیکن میں آٹھ دس سال سے روز ایسے مسئلے نبھاتی آئی ہوں سو آپ میرے لئے فکر مند نہ ہوں۔“ وہ پرسکون سی ہوئی تھی۔

”مسز زمر!“ انہوں نے اب کے ترجمے سے دیکھا۔ ”مجھے آپ سے ہمدردی ہے اور میں آپ کی مدد کرنا چاہتا ہوں۔ کیونکہ میری مدد کے بغیر یہ کیس کبھی عدالت میں نہیں چل سکتا۔ آپ جج کو خرید بھی لیں تب بھی ہاشم...“ وہ مزید قریب ہوئے، ”آواز اب سرگوشی میں بدل گئی تھی اور نظریں زمر پہ جمی تھیں۔“ ”کبھی تاریخیں نہیں لینے دے گا آپ کو۔ تاریخ پہ تاریخ دیتا جائے گا۔ لٹکا تا جائے گا۔ بارہ تیرہ سال تک کیس چلے گا۔ ہر سال میں دو پیشیاں ہوں گی۔ گواہ مرکب جائیں گے۔ سرکاری ریکارڈ کھوجائے گا۔ اخبارات و میڈیا اس قصے کو بھول چکا ہوگا۔ تیرہ سال آپ تو لڑیں گی اور آپ لڑ سکتی ہیں لیکن آپ کا یہ پیارا سا معصوم سا بچہ نہیں لڑ سکے گا۔ آپ کو ابھی اندازہ نہیں ہوا مگر وہ ذہنی طور پہ پارل نہیں رہا۔ وہ یا تو تنگ آ کر خودکشی کر لے گا یا کسی دن جا کر ہاشم کو گولی مار دے گا۔ وہ... اتنا لمبا... انتظار... نہیں کرے گا مسز زمر!“

زمر کی آنکھوں میں کرچیاں ابھریں، مگر گردن مزید اڑ گئی۔ ”یہ... آپ کا... مسئلہ... نہیں ہے۔“ انہی کے انداز میں ہوئی۔

”مگر آپ کا تو ہے نا۔ اور وہ کیا ہے کہ مجھے آپ سے ہمدردی ہے۔“ وہ نرمی سے ذرا جھک کر بولے تھے۔ ”تیرہ سال... چلیں دس سال بعد آپ کے ہاتھ میں کیا ہوگا؟ اولاد تو آپ کی ہو نہیں سکتی میں واقف ہوں (زمر کی آنکھوں میں سرخی ابھری) لیکن جو بچے آپ کے لئے اولاد کی طرح ہیں وہ رل جائیں گے۔ وہ کبھی دوبارہ زندگی شروع نہیں کر سکیں گے۔“

”آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟“

”میں چاہتا ہوں کہ میں ہاشم کو راضی کر لوں اور وہ کیس لڑنے کے لئے تیار ہو جائے۔ ہار ایسوی ایشن کے صدر کو پولیس گولیاں مارتی ہے تو سارے وکیل اکٹھے ہو جاتے ہیں پولیس کے خلاف کیس لڑتے ہیں اور چھ سات ماہ میں قاتلوں کو سزا دلواتے ہیں۔ چھ سات ماہ میں

زمر صاحبہ فیصلہ آجاتا ہے وہ بھی پولیس کے خلاف اس ملک میں جہاں فیصلے آنے میں برسوں لگ جاتے ہیں۔ مگر کیسے؟ کیونکہ وکیل چاہتے تھے کہ فیصلہ آئے۔ اس ملک میں اگر وکیل نہ چاہے تو کوئی فیصلہ نہیں آ سکتا چاہے اس کے حق میں ہو یا خلاف ہو۔ ہاشم چاہے گا تو کیس چلے گا وہ نہیں چلے گا۔ اور ہاشم کو صرف میں راضی کر سکتا ہوں اور کوئی شخص یہ کام نہیں کر سکتا۔ آپ کی وہ نئی رفیق صاحبہ ای صاحبہ بھی نہیں۔ اب آپ بتائیے کیا میں راضی کروں ہاشم کو؟“ اب کے وہ پرسکون لگتے تھے ذرا مسکرا کر ہمدردی سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

”اور مہینہ بد لے میں مجھے کچھ کرنا ہوگا۔ بتائیے کیا کروں میں جس کے بدلے میں آپ یہ عنایت کریں گے میرے اوپر؟“

”آپ فارس کو چھوڑ دیں!“

آسمان سے کوئی تارہ زور سے ٹوٹ کر گرا تھا، گویا کسی فرشتے نے کسی باتیں اچکنے والے شیطان کو دے مارا ہو۔ تارہ تھایا آگ کا گولہ۔ زمین پہ گر کر ہر شے کو بھسم کر گیا تھا۔

”میں... فارس کو... چھوڑ دوں؟“ وہ چند لمحے سنجیدگی سے اس کی آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر ایک دم ہنس دی۔ وہ بھی ہلکے سے ہنس دیے۔

”مگر میں سنجیدہ ہوں مسز زمر۔ فارس کو آپ کچھ دے تو سکتی نہیں ہیں ویسے بھی آپ گروے کی مریض ہیں، آپ کی زندگی کم رہ گئی ہے، اللہ آپ کو زندگی دے، میری تو یہ دعا ہے، مگر حقیقت پسندی کا مظاہرہ کریں۔ آپ پہلے ہی جس شخص کی زندگی میں بوجھ بنی ہوئی ہیں، اس سے نکل جائیں اور جس بچے سے آپ کو محبت ہے، اس کو اس بوجھ سے آزاد کر دیں۔“

”ہارون صاحب۔“ اس نے مسکراہٹ دبائے چمکتی آنکھوں سے انہیں دیکھا۔ ”آپ اپنی بیٹی کے لیے اتنی تنگ و دو نہ کریں تو اچھا ہے۔ اس کی تو ہاشم سے شادی ہو رہی ہے، ہنا، نوشیرواں سے ذکر سنا تھا، سو میرا خیال ہے اس کے مسئلے سنبھالنے کے لئے ہاشم کا ردار کافی ہے، اور رہی میں تو...“ بائیں کندھے سے لٹکتے پرس کو اتار کر دائیں پہنٹھل کرتے وہ مسکرا کر بولی۔ ”جو میرا ہے... وہ میرا ہے گا!“ ایک آخری چمکتی نظر ان پہ ڈال کر وہ مڑ گئی۔

ہارون نرم مسکراہٹ کے ساتھ اسے جاتے دیکھتے رہے۔

چند لمحوں بعد سڑک پہ گاڑی دوڑ رہی تھی۔ ڈرائیونگ کرنا سعدی کچھ کہہ رہا تھا... اور وہ کھڑکی کے باہر بھاگتے پوٹو اور بتیاں دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں کی جوت بچھ چکی تھی اور گود میں رکھے پرس میں ڈالا ہوا تھ مسلسل اندر موجود ڈبی کھول بند کر رہا تھا۔ ٹک... ٹک... ٹک... ننھے تارے جیسے ہیرے والی لونگ کی ڈبی کا ڈھکنا بار بار گرنے اور اٹھنے کے باعث مدھم سی آواز نکالتا تھا....

ٹک... ٹک... ٹک...

ہاشم رات کے ڈیڑھ بجے تھانے سے گھر چلا آیا۔ پولیس اتنے دباؤ اور جنگل کی آگ کی سی پھیلتی خبر کے بعد کسی صورت نوشیرواں کو رہا نہیں کر سکتی تھی۔ اب مزید کوشش کرنا خود کو ایک جاہل اور قانون شکن با اثر آدمی ظاہر کرنا تھا اور فلائنگ راپٹ ہاشم کا ردار کے سفید کالر کو یہ گوارا

نہ تھا۔

”ایک لڑکا جس کو میں نے اپنے چھوٹے بھائی کی طرح ٹریٹ کیا....“ ہاہرمیڈیا کے نمائندوں کے مائیکس کے سامنے چہرہ کیے، کار کا دروازہ کھولے کھڑا وہ کہہ رہا تھا۔ ”جس کی بازیابی کے لئے سب سے زیادہ کوششیں میں نے کیں، وہ ذرا سے جائیداد کے تازے کے باعث میرے بھائی کو اپنے کیس میں دھکیل رہا ہے، مجھے سوچ کر بھی شرم آتی ہے۔ یونوواٹ میں نے اپنی ساری زندگی قانون کی بالادستی کی نذر کی ہے، میں اس موقع پر اپنے عہدے اور طاقت کا ناجائز استعمال کر کے اپنے بھائی کو بغیر عدالت میں پیشی کے نہیں چھڑواؤں گا۔ اگر اس کا نام ایف آئی آر میں ہے تو پھر وہ اور تگزیم کاردار کا بیٹا ہی کیوں نہ ہو اس کو قانون کے تقاضوں کو پورا کرنا ہوگا۔ ہم ان لوگوں میں سے نہیں ہیں جو دولت یا طاقت کی فراوانی کے باعث خود کو فرعون سمجھنے لگتے ہیں۔ اس لئے کہ ہم پیسے والے ہیں، ہمارے اوپر انگلی اٹھانا بہت آسان ہے۔ یونوواٹ اب مزید میں ان لوگوں کو ”غریب کارڈ“ نہیں کھیلنے دوں گا۔ صبح ہم عدالت جا رہے ہیں اور اپنے بھائی کو وہیں سے چھڑوا کر گھر لائیں گے۔ ہمیں انصاف چاہیے۔ انصاف صرف غریب کے بچے کو نہیں چاہیے ہوتا، ہمیں بھی.... چاہیے!“ اور ہاتھ ہلا کر ”بس“ کا اشارہ کرتا کار میں بیٹھ گیا۔ مائیکس اس کے تعاقب میں جھکے مگر گاڑ کار کا دروازہ بند کر چکا تھا۔ ناگزیر حرکت میں آئے اور کارزن سے آگے بڑھ گئی۔

مورچال کے لاونج میں وہ سب بیٹھتی وی اسکرین پر چلتا نوشیرواں کا کلپ دیکھ رہے تھے۔ (حسین وہاں نہیں تھی۔) سعدی خاموش تھا اور زمر ابا کو بتا رہی تھی کہ کس طرح نوشیرواں اس وقت لاک اپ میں بیٹھا ہے۔

”بہتے دس دن میں وہ رہا ہو جائے گا، دو دن بعد وہ ملک سے باہر ہوگا اور اگلے پندرہ سال وہ واپس نہیں آئے گا اور تم دونوں پیچھے سے پیشیاں بھگتنا۔“ قارس نے اپنا کافی کنگ اٹھاتے ہوئے نہایت پرسکون انداز میں اطلاع دی۔ ”وکیل ٹوپا کستان!“ زمر اور سعدی پر ایک ”اچھا سوری“ والی نظر ڈال کر کندھے اچکا تا نگ ہونٹوں سے لگاتا، وہ آگے بڑھ گیا تو زمر پہلو بدل کر رہ گئی۔

”نہیں نکلے گا وہ باہر!“ سعدی اس کے جانے کے چند منٹ بعد ایک دم سے بولا تھا اور پھر اسی طرح اٹھ کر سیڑھیوں کی طرف بڑھ گیا۔ اس کے تاثرات عجیب سے ہو رہے تھے۔ زمر بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔ پھر بے اختیار سر جھٹکا جیسے کسی کی آواز کو.... صور جیسی آواز کو ذہن سے جھٹکا ہو.... (آپ اسے اس بوجھ سے آزاد کر دیں۔)

وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ سعدی ہے۔ وہ چند دن میں ٹھیک ہو جائے گا اور ہمیں انصاف ضرور ملے گا۔ وہ خود کو تسلی دینے لگی۔ دل سیاہ آسمان میں بار بار ڈوب کر ابھرتا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

سارا جوار بھانا میرے دل میں ہے مگر

الزام یہ بھی چاند کے سر جانا چاہیے

سعدی نے اوپری منزل پہ بنے اس بیڈروم کا دروازہ کھولا (جو امی نے اس کے لئے تیار کیا تھا) تو اندر اندر ہیرا تھا۔ موہا نل جیب سے نکالتے ہوئے اس نے سر جھکائے سوچ بچوڑ پھانگی رکھی تو کمرہ روشن ہو گیا۔ کسی احساس کے تحت اس نے چونک کر چہرہ اٹھایا۔ اس کے بیڈ کے کونے پہ حین بیٹھی تھی۔ الجھے سے بال ڈھیلی چوٹی میں بندھے تھے۔ گود میں کاغذوں کا ایک پلندہ رکھا تھا اور زخمی نگاہیں سعدی پہ جمی تھیں۔

”قارس ماموں نے مجھ سے پوچھا کہ.... میں ہاشم سے کیا بات کرتی تھی!“

”حین میں یہ بات اب ڈسکس نہیں کرنا چاہتا۔ میں جانتا ہوں کچھ عرصے بعد میں اسے بھلا کر تمہیں معاف کر دوں گا اور....“ بے زاری سے سر جھکتے وہ آگے آیا تو وہ کھڑی ہوئی۔ اٹھی گردن اور پورے قدم کے ساتھ۔

”معافی مانگی کس نے ہے آپ سے ہاں؟!“ کہنے کے ساتھ اس نے کاغذ سعدی کے قدموں میں پھینکے۔ کچھ نیچے گرے۔ کچھاڑ کر بکھر گئے۔

”سعدی یوسف خان!“ اس نے صدمے اور غصے سے بھری آنکھوں سے اسے دیکھتے اونچی آواز میں دہرایا۔ ”سعدی... یوسف... خان۔ یہ تھے وہ الفاظ جو انیس سو بہتر میسجور میں پانچ سو چھپن دفعہ استعمال ہوئے ہیں، یہ میرے ان تمام میسجور کا ریکارڈ ہے جو ان کو بھیجے تھے میں نے۔ بیک آپ سے نکالے ہیں میں نے اور آپ کو دکھانے لائی ہوں۔ دیکھیں اے۔ پڑھیں اے۔ مجھے نہیں معلوم کہ وہ آپ کو کیا بتاتا رہا ہے مگر میں اس سے آپ کی بات کرتی تھی۔ آپ کی سعدی بھائی، آپ کی بات کرتی تھی میں۔“ بولتے بولتے جذبات سے آواز بوجھل ہوئی اور آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ وہ بالکل خالی نظروں سے اسے دیکھے گیا۔

”پڑھیں ان میسجور کو۔ نہیں پڑھیں ان کو پلیز۔ میں نے ہمیشہ ان کو ہاشم بھائی کہا، کبھی غلط بات نہیں کہی ان سے۔ کسی سے ایسی بات کرنا غلط ہے یا صحیح اس سے قطع نظر میں نے کبھی ان سے.... کوئی.... غلط بات.... نہیں کہی۔ صرف آپ کی یا زمر کی یا گھر میں بڑھتی وحشت کی بات کرتی تھی۔ ہاں میں ان کو پسند کرتی تھی۔ کہیں دور اندراب بھی پسند کرتی ہوں۔“ اس کی بلند آواز کانپی۔ ”مگر کسی کو پسند کرنا گناہ نہیں ہوتا۔ پسند پہ انسان کا اختیار نہیں ہوتا۔ اس کے بعد وہ کیا کرتا ہے اس پر ہوتا ہے۔ میرا قصور نہیں ہے اس میں اگر میں ان کو پسند کرتی ہوں۔ جانتے ہیں کس کا قصور ہے؟“ وہ تین قدم آگے بڑھی اور خاموش لب بھنے کھڑے سعدی کی آنکھوں میں دیکھا۔

”آپ کا! آپ کا قصور ہے۔“ آنسو اب خشک تھے اور وہ سرخ آنکھوں سے اسے دیکھتی غرائی تھی۔ ”آپ تھے جو مجھے ان کے گھر لے کر گئے تھے اس رات جب نوشیرواں نے اغوا کا ڈرامہ کیا تھا۔ آپ تھے جو ہاشم کالا کرکھولنے میں اور اس کا راز جاننے میں اتنے معروف ہو گئے تھے کہ آپ کو خیال بھی نہیں گزرا کہ آپ کی بہن دوسرے کمرے میں ہاشم کے ساتھ ہے۔ آپ تھے جنہوں نے اس شخص کی اصلیت ڈیڑھ سال ہم سے چھپائی۔ ہمیں دوبارہ ان کے گھر پارٹی پہ لے کر گئے۔ پھر بعد میں آپ مجھے کہتے ہیں کہ اس کو کیوں بلایا کالج؟ ہاں بلایا تھا میں نے ان کو کالج۔ کیونکہ سعدی بھائی.... وہ قاتل ہے، کرپٹ ہے، بھونٹا مکار ہے، مگر وہ جج مینٹل نہیں ہے۔ وہ گلٹی ہے تو دوسرے گلٹی

لوگوں کو ایسے جج نہیں کرتا جیسے آپ نیک لوگ ہم گناہگاروں کو جج کرتے ہیں۔ کیوں بلایا میں نے اسے کالج؟ اس لئے کہ مجھے اس سے امید تھی کہ وہ مجھے برا نہیں سمجھے گا۔ آپ سے یہ امید نہیں تھی مجھے۔ کیوں بات کرتی تھی میں اس سے؟ کیونکہ مجھے کسی نے... آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں کہ وہ اندر سے کیسا ہے۔ مجھے کیا پتہ تھا وہ کیسا ہے؟ صرف یہ کہہ دینا کہ اس کو کبھی نہیں بلانا آئندہ کافی نہیں ہوتا۔ مجھے وجہ نہیں بتائی مجھے اس کی اصلیت نہیں دکھائی... پھر مجھے پالزام کیوں ڈالتے ہیں؟“ وہ مثل کھڑا اس رہا تھا اور وہ آخر میں ٹھہر کر... اس کی آنکھوں پہ نظریں جمائے چاچا کر بولی۔

”میرے دل کا خون کرنے والے ہاتھ میرے نہیں تھے۔ آپ کے تھے!“ پھر کی ٹھوکر سے ان کاغذوں کو مزید بکھیر دیا۔ ”آپ کا فرض تھا مجھے بتانا مجھے اس کی اصلیت دکھانا۔ میں انیس سو دس کی لڑکی نہیں ہوں جس کو دھونس زبردستی سے ڈانٹ ڈپٹ کر آپ کچھ بھی کرنے پہ مجبور کر سکتے ہیں۔ میں اکیسویں صدی کی لڑکی ہوں میرے پاس میرا ذہن ہے اور ذہانت ہے۔ میرے دور کی لڑکیوں کے بھائیوں کو یہ بھول جانا چاہیے کہ وہ غصہ کر کے حکم دے کر یا پابندیاں لگا کر اپنی بچیوں کو کسی سے موہا نکل پہ بات کرنے سے روک سکتے ہیں۔ جب تک وہ برابری کے لیول پہ آ کر اپنی بہن کے ساتھ بیٹھ کر اس کو دلائل سے نہیں سمجھائیں گے وہ ان کی بات نہیں مانے گی۔ ہا ہر کے لوگ ہمارا دل ایسے نہیں توڑتے بھائی جیسے ہمارے اپنے مرد ہمیں توڑ جاتے ہیں۔“ آخری لفظ پہ اس نے ہنسی لی اور پھر اس کے ساتھ سے نکل کر وہ وازے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ جا چکی تھی اور سعدی تنہا خاموش کھڑا تھا۔ پھر دفعتاً وہ جھکا اور ایک ایک کاغذ اٹھانے لگا۔ سب کو اکٹھا کیا، برابر کیا اور پھر اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں ڈال دیا۔ بغیر پڑھے بغیر دیکھے اس کا چہرہ اب بھی ویسا ہی تھا۔ سنجیدہ اور خاموش۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

جلتی ہیں روز جس کے اشارے پہ بستیاں

اس آنکھ تک دھوئیں کا اثر جانا چاہیے

اگلی صبح دھند میں واضح کمی محسوس ہوتی تھی۔ سورج نکھر نکھر اسانکا کھڑا تھا اور ہارون عبید کی رہائش گاہ کے سارے شیشے دھوپ سے چمک رہے تھے۔ لاؤنج میں ہارون شلوار سوٹ اور کوٹ میں ملبوس مصروفے پہ براجمان سوچتی نگاہوں سے ٹی وی اسکرین کو دیکھ رہے تھے جہاں نوشیرواں کی گرفتاری کی کلپنگ بار بار دکھائی جا رہی تھی۔

”معروف آئی پی پی کا بیٹا نوشیرواں کاردار جس کو کل شام وارنٹ گرفتاری جاری ہونے کے بعد اسلام آباد کے ایک ریسٹ ہاؤس سے گرفتار کیا گیا تھا اس وقت پولیس کی تحویل میں ہے اور آج اس کو عدالت میں پیش کیا جائے گا۔ جہاں پولیس اس کے جسمانی ریمانڈ کے لئے درخواست دے گی اور قوی امکان ہے کہ ابھی چند دن تک نوشیرواں کاردار اپنے گھر نہیں جاسکیں گے۔“

ہارون نے ریموٹ اٹھا کر بٹن دبایا۔ اسکرین بجھ گئی۔ وہ کچھ دیر بیٹھ رہا۔ خاموش لاؤنج میں خاموشی کی چاپ سنتے رہے۔ پھر اٹھے

اور پیچھے سے قمیض جھٹک کر دبا کرتے آگے بڑھ گئے۔

اوپر آ کر وہ آبی کے کمرے کے سامنے کے دروازہ کھٹکھٹایا پھر دھکیلا۔

”آبدار۔ بچے تم نیچے کیوں بیٹھی ہو؟“ وہ بیڈ کی پائنتی کے قریب زمین پر اکڑوں بیٹھی تھی۔ سرخ ہال بکھر کر کمرہ گر رہا تھا اور آنکھیں گیلی تھیں۔ وہ ترسم سے اسے دیکھتے آگے آئے اور بیڈ کے کنارے آ بیٹھے۔ ”آبی۔“ انہوں نے دوبارہ پکارا۔

”اے لگتا ہے میں ڈرامہ کرتی ہوں۔ اے لگتا ہے میں اس کی نیک نامی کے لئے خطرہ ہوں۔“ اس نے گیلی آنکھیں اٹھا کر گد آمیز نظروں سے باپ کو دیکھا۔ ”ہا ہا... مجھے ہر چیز سے وحشت ہونے لگی ہے۔ ہر شخص سے۔“

”آبدار... اتنا نہیں سوار کرتے کسی کو حواسوں پر کہ...“

”یہ اپنے اختیار میں نہیں ہوتا ہا ہا...“ اس نے شکستگی سے نفی میں سر ہلایا تھا۔ ”میں بہت بری طرح ٹوٹ گئی ہوں۔ میں سارا دن اس کی کال کا انتظار کرتی ہوں۔ میں نے اس کے نمبر کی رنگ ٹون بھی بدل دی ہے کہ اسکرین دیکھنے سے پہلے مجھے اس کی کال کی خبر مل جائے۔

میں ہر چند منٹ بعد واٹس ایپ پر اس کا اسٹ سین دیکھتی ہوں۔ اگر وہ آن لائن ہو تو لگتا ہے وہ میرے دسترس میں ہے۔ جیسے کوئی ڈوری سی ہو میرے اور اس کے درمیان۔ مگر میں اسے مسیج نہیں کر سکتی ہا ہا۔ کیونکہ پھر وہ مجھے بلاک کر دے گا۔ میرا دل بہت ٹوٹا ہوا ہے ہا ہا۔“ اس نے اپنا سران کے گھٹنے پر کھدایا اور رونے لگی۔ اس کی رنگت زرد تھی اور حلیہ بے ترتیب۔

”آبی... تم کیا چاہتی ہو؟“ انہوں نے اس کا سر تھپکتے ہوئے پوچھا تھا۔

”آپ نے مجھے کبھی کچھ نہیں دیا۔ میری ماں کو بھی مجھ سے چھین لیا۔ مجھے وقت بھی نہیں دیتے۔ میری سالگرہ بھی یاد نہیں رکھتے۔ آپ مجھے ”وہ“ بھی نہیں دے سکتے۔“ نفی میں سر ہلاتی وہ سیدھی ہوئی اور بند مٹھیوں سے آنکھیں رگڑنے لگی۔

”سوائے ہاشم کا روار کے تم دنیا میں جس کو بھی میرے سامنے لے آؤ گی میں اسے قبول کر لوں گا۔“

”مجھے ہاشم سے کوئی سروکار نہیں ہے ہا ہا۔“ وہ غصے سے سر جھٹک کر بولی تھی۔ ”مجھے جو چاہیے وہ unavailable ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اور آپ... آپ کچھ بھی نہیں کر سکتے میرے لئے۔ میں بابا اب ساری زندگی تکلیف میں رہوں گی۔“

اس کی سبز سرمئی آنکھوں کے کٹورے پھر سے بھرنے لگے۔ ہارون کچھ دیر غور سے اسے دیکھتے رہے۔

”وہ تمہیں مل جائے گا میں تم سے وعدہ کرتا ہوں۔ اب اٹھو بچے۔ کھانا کھاؤ اور کپڑے بدل لو پھر اپنے کلینک جاؤ خود کو کام میں مصروف کرو۔“

مگر وہ ان کے پہلے الفاظ پر چونک کر انہیں دیکھنے لگی تھی۔ ”آپ... وعدہ کرتے ہیں؟“ مایوسی کے آسمان پر امید کا تارہ سا چمکا تھا۔

”ہاں میں وعدہ کرتا ہوں۔“ انہوں نے اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں لے کر یقین دلایا تھا۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو غائب ہونے لگے اور ان کی جگہ الجھن نے لے لی۔

”مگر... کیسے؟“

”تم مجھے بتاؤ.... کیسے؟ وہ کیسے آئے گا تمہاری زندگی میں؟“

”وہ جب تک اس کی زندگی میں رہے گی وہ مجھے نہیں ملے گا بابا۔“ تارہ ڈوبنے لگا۔

”وہ اس کی زندگی سے چلی جائے گی۔ میں وعدہ کرتا ہوں وہ چلی جائے گی۔“

آبدار کی ان پہنچتی آنکھوں میں کچھ چمکا تھا۔ ”کیسے؟ آپ کو کیسے پتہ؟“

”میں نے رات اس کو دیکھا تھا۔ زمر کو۔ میں نے اس سے بات کی تھی۔ سعدی یوسف کے کیس سے متعلق۔ چہرے پڑھنے آتے ہیں

مجھے۔ وہ اسے چھوڑ دے گی بہت جلد۔“

”آپ نے اسے کچھ کہا تو نہیں؟ بابا پلیز آپ ان کوئی کوئی دھمکی وغیرہ نہیں دیں گے۔ وہ اچھے لوگ ہیں۔ میں....“

”نہیں میں کیوں کچھ کہوں گا؟ مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں وہ اس کو چھوڑ دے گی۔“

”کیا اس نے خود ایسا کہا؟“ آبی کا دل اٹک گیا تھا۔

”نہیں اسے ابھی خود بھی معلوم نہیں مگر میں تمہیں بتا رہا ہوں بیٹے میں لوگوں کا اخبار کی طرح پڑھتا ہوں ساری زندگی پڑھتا آیا ہوں۔ وہ

... اسے... چھوڑ دے گی!“ پھر اس کا سر تھکتے ہوئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ”اب فریش ہو جاؤ میں ڈائننگ ٹیبل پہ تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ کھانا

اکٹھے کھاتے ہیں۔“

آبدار کے لبوں پہ نرم مسکراہٹ بکھر گئی۔ وہ سر ہلاتے ہوئے اٹھنے لگی۔ قدموں میں بالکل جان نہیں تھی۔ جانے کب سے کچھ نہیں کھایا

تھا۔ ہارون اب اسے سہارا دے کر کھڑا کر رہے تھے۔ چند دن میں ہی وہ اتنی کمزور نظر آنے لگی تھی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

وحشتیں بڑھتی گئیں حجر کے آزار کے ساتھ

اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں منہ آزار کے ساتھ

دانتے کی جہنم جیسا احاطہ عدالت آج بھی لوگوں سے کچھ کھینچ بھرا تھا۔ نو شیرواں کاردار کو سپاہی ہتھکڑیوں میں مقید کیا اپنے ساتھ چلاتے

لا رہے تھے۔ وہ اسی ویسٹ میں ملبوس تھا جس میں ساری رات لاک اپ میں بیٹھے کائی تھی۔ سردی کے باوجود آستین چڑھا رکھے تھے۔

چہرے پہ سنجیدہ تاثر تھا اور آنکھیں شب بیداری کے باعث گلابی پڑ رہی تھیں۔ سامنے سے انسان چلے آ رہے تھے۔ بے نیاز میز تیز چلتے

ہوئے۔ عجیب خوفناک لوگ۔ اور پھر ان کا شور ہی شور۔ وہ سامنے دیکھ کر نہیں چل رہا تھا نظریں جھکی تھیں۔ اسے راہداری میں چلتے اپنے

قدم نظر آ رہے تھے۔ ساتھ میں ہاشم کے چمکتے بوٹ بھی۔ سپاہیوں کے رگڑ رگڑ کر پالش کیے جوتے بھی۔ آوازیں بھی سنائی دیتی تھیں۔

وکلہ کی فوج ان کے ہمراہ تھی۔ سامنے کھڑے صحافی اور کیمرہ مین سوالوں کی بوچھاڑ کرتے اٹنے قدموں پیچھے ہٹ رہے تھے۔

”ہاتھ اٹھا کر وکٹری کا نشان بناؤ اور مسکرا کر یہاں سے گزرو۔“ ہاشم نے قریب میں سرگوشی کی۔ اس نے ایک نظر اٹھائی اور جبراً مسکراہٹ لاتے وکٹری کی دو انگلیاں اوپر اٹھائیں۔ ایک رات لاک اپ میں کاٹنے کے بعد اسے معلوم ہو گیا تھا کہ اس برزخ سے اسے ہاشم کے علاوہ کوئی نہیں نکال سکتا اس لیے وہ اس کا ہر حکم ماننے کا پابند تھا۔

صحافیوں کا جھوم ایک جگہ آکر رکنا تھا رک گیا وہ لوگ آگے بڑھتے گئے۔ شیرو نے وکٹری کی انگلیاں گرا دیں۔

”یہ ہمارے انویسٹرز کے لئے تھا ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ ہم پر اعتماد ہیں۔“ ہاشم اسے کہہ رہا تھا۔ وہ نہیں سن رہا تھا۔ نظریں پھر سے جھکا دی تھیں۔

”زیادہ سے زیادہ سات دن تک رہنا پڑے گا تمہیں لاک اپ میں پھر جیل بھیج دیں گے۔ اس کے بعد میں ضمانت کروالوں گا مگر ان سات یا دس دن میں تمہارا اندر رہنا بہتر ہے۔ optics کے لئے یہ اچھا ہے۔ کوئی بھی خبر میڈیا پر اس سے زیادہ نہیں شور مچاتی۔ خبر دب جائے گی لوگ تھک کر چپ ہو جائیں گے۔ ان سات دنوں میں ہم تین پارٹیز دیں گے مختلف جگہ حیرتی گیدرنگز میں جا کر پیسہ لٹائیں گے۔ یونو-optics کے لئے۔ چند ایک photo-ops کے بعد ہمارا امیج اور ہماری خیرات اس سارے گند کو دبا دے گی۔ صرف سات دن شیرو....“

الفاظ مدھم ہو رہے تھے.... کٹے کٹے سنائی دے رہے تھے۔ وہ بالکل سر جھکائے چلتا رہا۔ وہ ہاشم کو نہیں بتا سکتا تھا کہ لاک اپ کی ایک رات نے اسے وحشی طور پر کتنا پیچھے دھکیل دیا تھا۔ وہ رات کتنی ڈراؤنی تھی۔ کتنی خوفناک تھی۔ ہر جگہ زبردست گھر میں بہتا خون کا تالاب نظر آتا تھا۔ اور.... وہ چہرہ.... وہ نیچے گرے بوٹ کی ٹھوکروں سے زخمی لڑکے کا ہولناک چہرے کے ساتھ کہنا.... اللہ حساب لے گا....

نوشیرواں نے چہرہ اٹھایا۔ فضا میں مانوس سی خوشبو تھی۔ کافور کی سی۔ ہا سی گلاب کی خون آلود پتیوں کی سی مہک۔ اس نے سر اٹھایا۔ سامنے ایک دروازے کے ساتھ وہ دونوں کھڑے تھے۔ زمر اور سعدی۔ وہ دونوں چھپتی ہوئی نظروں سے انہیں دیکھ رہے تھے۔ اس کی نظریں سعدی سے ملیں۔ ان میں نفرت تھی۔ تپش تھی۔ اور ایسے زخم تھے جن کو مندمل ہونے میں صدیاں بیت جاتی ہیں۔

”میں دیکھ لوں گا تم سب کو۔“ ہاشم نے انگلی اٹھا کر تنفر سے کہا تھا۔ سعدی اور وہ ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ ”تم لوگوں کو بیس سال عدالت میں نہ لٹکا یا تو دیکھنا۔“ اور شیرو کا منظر بدلتا گیا۔ راہداری آگے بڑھتی گئی۔ وہ دونوں خاموش کھڑے جسے پیچھے رہ گئے....

☆☆☆☆☆☆☆☆

ایسا ہے کہ سینے میں سلگتی ہیں خراشیں

اب سانس بھی ہم لیں گے تو اچھا نہ کریں گے

سردی کا زور ہر گزرتے دن کے ساتھ کم ہوتا جا رہا تھا۔ جیل کے احاطے پہ گرتی سنہری روشنی سلاخوں سے لپٹ لپٹ کر ان کو پگھلا رہی تھی۔ چند ہلکاروں اور سادہ لباس میں موجود افسران کی معیت میں نوشیرواں کا دروازہ چلتا ہوا محن میں آگے بڑھ رہا تھا۔ جیل کا اے بلاک

اصولاً صرف اے کلاس قیدیوں کے لئے ہونا چاہیے تھا مگر یہاں ہر طرح کے قیدی تھے اور وہ اتنے کوئی خاص پڑھے لکھے اور خاندانی نہیں لگتے تھے۔ برآمدوں میں کھڑے قطار در قطار سفید پیلے لباس والے قیدی سرگوشیاں کرتے اس نوجوان کو اندر آتے دیکھ رہے تھے۔ وہ کوشش کر رہا تھا کہ ان کو نہ دیکھے مگر پیشانی پسینے میں تر تھی اور دل کی دھڑکن تیز تھی۔ اسے شدید گرمی لگ رہی تھی مگر وہ اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔ راہداری میں سے گزرتے اس نے سلاخوں والے دروازوں کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے لوگوں کو چھٹی آنکھوں سے خود کو دیکھتے پایا۔ اور جانے کہاں سے وہ آواز کان میں پڑی۔

”اس نے فارس غازی کے بھانجے پہ گولی چلائی تھی۔“

نوشیرواں کے حلق میں کچھ اٹکا۔ قدم اڑکھڑائے مگر وہ چلتا رہا۔

”اس نے غازی کے بھائی اور بیوی کو مارا تھا۔“

وہ نہیں کہہ سکا کہ ایسا نہ تھا۔ کہنے کو کچھ بھی نہیں تھا۔

مختلف راہداریوں اور برآمدوں سے گزرتے ہوئے اس نے لوگوں کی بہت سی باتیں سنیں۔ وہ اس پہ ہنس رہے تھے، غصہ کر رہے تھے، اسے غازی کا مجرم گردان رہے تھے۔ وہ اسے گالیاں دے رہے تھے۔ ماں کی۔ بہن کی۔ بیٹی کی۔ وہ اس کا تمسخر اڑا رہے تھے۔ اس کی ہیرک آگئی تھی۔

وہ صاف ستھرا کشادہ سا کمرہ تھا۔ بیڈ مصوفے روم ریفریجریٹر اے سی ایچ بائو ایل سی ڈی ٹی وی ڈی وی ڈی پلیئر سب میسر تھا وہاں۔ اہلکار اس کو بستر پہ آرام کرنے کا کہہ کر اپنے مکمل تعاون کی یقین دہانی کروا رہا تھا۔ نوشیرواں سرخ پڑتی آنکھوں سے اسے دیکھتا بیڈ پہ بیٹھ گیا۔ وہ خاموش تھا۔ بالکل گونگوں کی طرح خاموش۔

ایک گالی کا برداشت کر لینا انسان کو کتنی گالیوں سے بچا لیتا ہے۔ کاش وہ ایک گالی برداشت کر لیتا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

اے دل ذرا سی جرات رندی سے کام لے

کتنے چراغ ٹوٹ گئے احتیاط میں

ڈاکٹر سارہ اپنے آفس میں گردن جھکائے بیٹھی میز پر رکھی نوٹ بک میں کچھ لکھ رہی تھی جب دروازہ ذرا سی آہٹ سے کھلا۔ سارہ نے قلم دانتوں میں دبائے آنکھیں اوپر اٹھائیں تو ٹھہر گئی۔ قلم دانتوں سے نیچے گرا۔ چہرہ ساکت ہو گیا۔

چوکھٹ میں سعدی کھڑا تھا۔ اور وہ پرانا سعدی بالکل نہیں لگ رہا تھا۔ جینز کے اوپر جیکٹ پہنے وہ آنکھوں میں چھتی ہوئی تپش لئے اسے دیکھ رہا تھا۔

”سعدی!“ اس کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھی۔

”تو یہاں چھپی ہوئی تھیں آپ؟“ اس کا لہجہ بھی بدلا ہوا تھا۔ سارہ کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ رنگت پھلکی پڑی۔
”سعدی!“

”مجھے کچھ نہیں سننا۔ میں یہاں اپنی جاب واپس لینے بھی نہیں آیا۔“ وہ اس پہ برہم نکاہیں جمائے چند قدم آگے آیا۔ ”میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں ڈاکٹر سارہ غازی کہ آپ میرے حق میں گواہی دیں گی یا نہیں؟“
”تم مجھ سے میرا حال بھی نہیں پوچھو گے؟“ اس کو دکھ ہوا۔

”نہیں، کیونکہ مجھے معلوم ہے آپ عافیت سے ہوں گی۔ یہ عافیت جو آپ نے خاموش رہنے کے عوض جتنی بھی یقیناً دیر پا ہوگی۔ میں ادھر قید میں مر رہا تھا اس سے آپ کو کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سو میں صرف یہ پوچھنے آیا ہوں کہ آپ... گواہی... دیں گی... یا نہیں؟“ وہ زور دے کر بولا۔ اتنے مہینے بعد ملاقات ہو رہی تھی اور پہلے جیسی کوئی بات ہی نہیں تھی۔
”میں تمہاری طرح بہادر نہیں ہوں سعدی!“

”میں بھی بہادر نہیں ہوں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہے میں نے کتنی راتیں جاگ کر گزاری ہیں صرف خوف کے عالم میں۔ سو مجھ سے بہادری کی بات مت کیجئے۔ میں صرف یہی بتانا چاہتا تھا۔ کورٹ آپ کو بلائے گی۔ اور آپ کو آنا ہوگا۔ اگر آپ اپنی مجرمانہ خاموشی کا مداوا کرنا چاہتی ہیں تو آپ آئیں گی ورنہ میرے خاندان اور خود مجھ سے آپ کا کوئی تعلق نہیں رہے گا۔“
”تم اتنے سخت دل کیسے ہو سکتے ہو سعدی!“ وہ افسوس سے بولی تھی۔

وہ ایک دم تیزی سے آگے آیا۔ ”میں نے... بھروسہ کیا آپ پر... آپ کو ایک قیمتی چیز دی۔ آپ نے اس کو بھی کھو دیا۔ آپ نے میرے لئے گواہی بھی نہ دی۔ اگر اس وقت آپ کچھ بول دیتیں تو حسین... میرے گھر والے... وہ اتنے ماہ ہاشم کے قریب نہ رہتے۔ اس لئے دل کی سختی کی بات مجھ سے مت کریں۔ اور فیصلہ کریں۔“ ایک قہر آلود نگاہ اس پہ ڈال کر وہ باہر نکل گیا اور اپنے پیچھے دروازہ زور سے بند کر دیا۔
سارہ فکر مند سی وہیں کھڑی رہ گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

کچھ میں ہی جانتا ہوں جو مجھ پہ گزر گئی

دنیا تو لطف لے گی مرے واقعات میں

تیز دھوپ میں بینک کی عمارت جھلس رہی تھی۔ بیرونی سیڑھیاں اترتا پی کیپ سے چہرے پہ سایہ کیے کرنل خاور والٹ جیب میں ڈالتا چلا آ رہا تھا جب اس کا موبائل بجا۔ اس نے زینے اترتے اچنبھے سے موبائل نکالا پھر دھوپ کے باعث اسکرین پہ ہاتھ کا چھبانا کر دیکھا۔ جلتا بجھتا نمبر شناسا تھا۔ بہت شناسا۔ اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا۔ وہ تیزی سے فون کان سے لگاتا، مگر حقاط سا ”ہیلو“ کہتا کار کی طرف آیا۔

”خاور!“ میں بول رہا ہوں!“ ہاشم کی سنجیدہ آواز سنائی دی تھی۔ خاور کے چہرے پہ بہت سے رنگ ابھرے.... جذبات.... دکھ.... مگر جب بولا تو لیوں سے بس اتنا نکلا۔

”لیس سر!“

”میں جانتا ہوں تم کہاں ہو تمہارا نمبر بھی ٹریس کروالیا ہے، لیکن.... میں کسی کو تمہیں پکڑنے نہیں بھیج رہا۔“ وہ رکا۔ اس کی آواز دھیمی تھی اور تاسف انگیز تھی۔

”خاور.... میں بہت اکیلا ہوں۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ شیر و جیل میں ہے اور چیزیں میرے ہاتھ سے نکلتی جا رہی ہیں۔“

”میں جانتا ہوں سر!“ وہ چلتے چلتے سایے میں کھڑی کار تک آگیا تھا۔ ایک دم جیسے سکون سا آگیا، جھلساتی دھوپ سے سائبان مل گیا ہو۔

”مجھے ہر حالت میں اس کیس کو.... یوسف خاندان کو.... پکڑنا ہے۔ تم میری مدد کرو گے؟ ہر بات بھلا کر۔ جو میں نے تمہارے ساتھ کیا، میں جانتا ہوں تم مجرم نہیں تھے اگر تم اس سب کو بھلا سکو تو میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں۔ ایوبیہ والے کالج میں.... کل شام پانچ بجے کے قریب.... اگر تم دوبارہ میرے لئے کام کرنا چاہو تو میں انتظار کروں گا تمہارا۔“

”جو حکم سر!“ خاور کی آواز بھیگ گئی تھی۔ ہاشم کی کال بند ہو چکی تھی اور وہ اس سائبان میں کتنی ہی دیر کھڑا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں گلابی نمی تھی مگر چہرے پہ طمانیت تھی۔ سرائٹا کر اس نے ایک تشکر آمیز نظر آسمان پہ ڈالی، پھر کار میں بیٹھا۔

کار چلانے کی بجائے وہ موبائل پہ ای میل چیک کرنے لگا۔ دو دن قبل کی موصول ہوئی ای میل جسے وہ بار بار پڑھ چکا تھا، ایک دفعہ پھر کھولی۔

”میں جانتا ہوں تم میری میل ضرور پڑھو گے۔ وقت تمہارے ہاتھ میں ہے خاور، جو اس تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اپنے تمام گناہوں کا کفارہ دینا چاہتے ہو تو کاردارز کے خلاف گواہی دو۔ میرے حق میں گواہی دو۔ ہم تمہیں وقتوں کے لئے معاف کر دیں گے۔ تمہارا دامن صاف ہو جائے گا۔ وقت ابھی تمہارے ہاتھ میں ہے۔“

سعدی یوسف خان

”تم سے معافی مانگی کس نے ہے؟“ اس نے نفی میں سر جھٹکتے ہوئے متفطر سے کہا اور کنکیشن میں چابی گھمائی۔ گاڑی میں ایک دم حرکت سی بیدار ہوئی تھی جیسے منجھد ہوئی وفا ایک لمحے میں جاگ اٹھتی ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

یہ بستی ہے ستم پروردگار کی
یہاں کوئی کسی سے کم نہیں ہے

شام شہر کے دوسرے حصے پہ بھی ٹھنڈی سی پھیل رہی تھی۔ اس آفس میں خاصا رش تھا۔ لوگوں کی چہل پھل، کیمین کے ساتھ ٹولیوں میں کھڑے درکرز، شور، آوازیں۔ ایک آفس کے شیشے کے دروازے بند تھے اور اندر سفاری سوٹ میں ایک اویسز عمر آدمی بیٹھا ریسیور کان سے لگائے تیز تیز پنجابی میں کچھ کہے جا رہا تھا۔ سامنے دو کرسیوں میں سے ایک پہ سعدی بیٹھا تھا۔ آگے ہو کر۔ مضطرب، بے چین۔ دوسری پہ فارس پیچھے ہو کر ناگ پٹا ناگ جمائے آرام وہ انداز میں بیٹھا، مسلسل دو انگلیوں سے کان کی ٹومسل رہا تھا۔

”ہاں جی میں فائل ملتے ہی آپ کو خبر کرتا ہوں۔ اچھا جی۔“ اس نے ریسیور رکھا اور دونوں ہاتھ باہم پھنسائے آگے کو ہو کر سعدی کو مخاطب کیا۔ ”ہاں جی۔ سعدی یوسف صاحب۔ یہ شو شروع ہونے سے پہلے کا ایک گھنٹہ ہے اور اس وقت میں عموماً کسی سے ملتا نہیں، لیکن خصوصی طور پہ آپ کو بلایا ہے تو آپ سمجھ سکتے ہوں کہ اہم بات کرنی ہوگی۔“ وہ عینک اتار کر میز پر رکھے مصروف مگر خشک سے انداز میں کہہ رہا تھا۔

”مجھے آپ کے سیکرٹری نے فون پہ کہا تھا کہ آپ میرا انٹرویو کرنا چاہتے ہیں۔“ سعدی نے سنجیدگی سے کہا۔ بار بار وہ فارس کو دیکھتا تھا جو بالکل خاموش بیٹھا تھا۔

”ہاں جی ایسا ہی ہے۔ دس بجے کے شو کے ٹی آر پی ز آپ جانتے ہیں کیسے آسمانوں سے بات کرتے ہیں، اوپر سے ملک کا نمبر ایک چینل ہے اور میری شکل اور ساکھ سے ملک کا بچہ بچہ واقف ہے۔“

”جیلانی صاحب، مجھے دوسرے چند چینلوں سے بھی کال آئی ہے۔“ سعدی درمیان میں تیزی سے بولا۔ ”لیکن میں آپ سے ملنے اس لئے آیا ہوں کیونکہ میں اپنی کہانی صرف ایک دفعہ سنانا چاہتا ہوں اور کسی ایسے شو اور ایسے چینل پہ جہاں مجھے لگے کہ واقعی پورا ملک مجھے دیکھ اور سن رہا ہے۔“

”بالکل جی ویسے بھی اگلے ہفتے سے قومی اسمبلی کا اجلاس شروع ہو رہا ہے، آپ کی کہانی کے لئے کسی کے پاس وقت نہیں ہوگا بعد میں اگر کیس چلتا ہے تو عدالت میڈیا ٹرائل پہ پابندی لگا دے گی اور آپ انٹرویو نہیں دے سکیں گے، یہی وقت ہے آپ کو اپنی کہانی سنانی ہے۔ میرے دو شووز... ایک میں بات کر نہیں ہوتی نا۔ سو دو شووز کریں گے ہم... اس منگل اور بدھ کو... دو شووز میں آپ اسٹار بن جائیں گے۔ سوشل میڈیا سے نکل کر آپ ہر شخص کے گھر تک جا پہنچیں گے۔“

”اوکے!“ سعدی نے سنجیدگی سے سر ہلایا۔ پھر فارس کو دیکھا۔ وہ خاموش بے نیاز سا لگ رہا تھا۔ شاید لبوں میں کچھ چبا بھی رہا تھا۔ ”ٹھیک ہے۔ آپ پھر تیس لاکھ جمع کرادیں، لیکن کیش کی صورت میں۔ بینک اکاؤنٹ ڈیٹیلز میں کسی کو دیتا نہیں ہوں، مسئلے ہو جاتے ہیں بعد میں۔ یہ میرا ایڈریس ہے، آپ ادھر پیسے لے آئیے گا، اسی ہفتے پھر ہم منگل اور بدھ کے دو شووز کر لیں گے۔“ کاغذ پہ پتہ لکھ کر اس نے سعدی کی طرف بڑھایا جو پلک جھپکے بنا اس کو دیکھ رہا تھا۔

”تیس لاکھ کس چیز کے؟“

”چلو جی!“ جیلانی نے اکتا کر پہلو بدلا۔ ”دیکھو بیٹا میرے شو کا وقت ہونے والا ہے اب فضول کی بحثوں اور جائز ناجائز کے چکروں میں پڑنے کا وقت نہیں ہے میرے پاس، ننانوائی ہے بغیر پیسوں کے یہاں کوئی تمہیں شو میں نہیں بلائے گا میرے جیسا نہ کرو کبھی بھی نہیں۔ اوہ بیٹا....“ پھر سمجھانے والے انداز میں کہنے لگا۔ ”اس میں کوئی غلط بات نہیں ہے پر اتم نام پہ اشتہار چلوانے نا.... تمیں سیکنڈ کے اشتہار کو ایک دفعہ چلوانے کی تین لاکھ سے کم فیس نہیں ہوتی۔ صرف ایک دفعہ کی بات کر رہا ہوں میں۔ یہ موبائل کمپنیاں، شیمپو والے یہ لوگ، روز کے کروڑوں کے اشتہار چلواتے ہیں۔ میں تمہیں پر اتم نام کے دو گھنٹے دے رہا ہوں، تمیں لاکھ اس لحاظ سے کم ہیں مگر چونکہ تم نے اتنی جرات کا مظاہرہ کیا ہے، اتنا ظلم ہوا ہے تمہارے ساتھ اس لئے یہ رعایت ہے تمہارے لئے۔ آگے تم سوچ لو۔ کاردارز کے خلاف اپنی کہانی بیان کرنے نکلو گے تو بغیر پیسوں کے کوئی اسٹوڈیو میں کھسنے بھی نہیں دے گا۔“

سعدی اٹھا اور خاموشی سے باہر نکل گیا۔ فارس دھیرے سے کھڑا ہوا مسکرا کر جیلانی صاحب سے ہاتھ ملایا۔ ”میں اسے سمجھا دوں گا۔ ہم پیسوں کا بندوبست کر لیں گے۔ آپ شو کی تیاری رکھیں۔“ متانت سے کہہ کر وہ اس کے پیچھے آیا۔

وہ تیز تیز پارکنگ ایریا میں چلتا جا رہا تھا۔ باہر آسمان اب گہرا سیاہ ہو رہا تھا۔ اکا دکا تارے بھی ابھرنے لگے تھے۔

”سعدی!“ وہ کار تک پہنچا تو فارس تیز تیز چلتا اس سے آگے۔ ”ہم پیسے دے سکتے ہیں ہمارے پاس ہیں پیسے!“

سعدی نے بے یقینی اور دکھ سے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ ”میں اس شخص کا دوبارہ نام بھی نہیں سننا چاہتا۔ اور کیوں دیں ہم پیسے؟ میں انصاف لینے اس لئے نکلا تھا تا کہ مجھے کوئی غلط کام نہ کرنا پڑے، تا کہ میں قانون کا راستہ اپناؤں غرنت ڈور سے اپنی منزل میں داخل ہوں۔ نہیں استعمال کرنے مجھے یہ بیک ڈورز۔“ شدت غم سے اس کا چہرہ سرخ پر رہا تھا۔ ”اور آپ وہاں بالکل خاموش بیٹھے رہے۔ ایک لفظ نہیں بولے اور نہیں تو دو چار کئے تو جزی سکتے تھے اس نہ کر کو۔“

”استغفر اللہ میں شریف آدمی ہوں۔ ایسا کیوں کرتا؟“ وہ خفا ہو کر کہتا گھوم کر ڈرائیونگ ڈور کی طرف بڑھ گیا۔ سعدی اسی طرح غم و غصے سے ہیرٹج کر رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

سبل کی رہگزر ہوئے، ہونٹ نہ بھر بھی تر ہوئے

کیسی عجیب پیاس تھی، کیسے عجب سحاب تھے!

اوائل مارچ کی وہ شام اپنے نیلے اندھیروں میں ڈھیروں تارے نائکے چھایا بنی کھڑی تھی۔ موسم سرد اور خشک تھا۔ ساکت۔ جامد۔ ہاشم کاردار خوبصورتی سے آراستہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ صوفے شام کے اندھیروں جیسے نیلے تھے اور ان پہ نہرے اجلا جلا سے کشن رکھے تھے۔ ناگنگ پناگ چڑھائے، گرے سوٹ میں ملبوس، وہ گاہے بگاہے کلائی کی گھڑی دیکھ رہا تھا....

ایوبیہ کی اس آبادی سے دور گھنے درختوں سے ڈھکی وادی میں اونچائی پہ بناوہ خوبصورت بنگلہ گہری شام میں روشن نظر آتا تھا۔ خاوند نے

ہا ہر سڑک پہ کھڑے گردن اٹھائے اس بنگلے کی روشن کھڑکیوں کو دیکھا.....

ہاشم کاردار منتظر خاموش سا صوفے پہ بیٹھا تھا۔ وقفے وقفے سے وہ وال کلاک کو بھی دیکھتا تھا۔ چہرہ سنجیدہ اور سپاٹ تھا، مگر وقت نکلا جا رہا تھا۔ جانے کتنی دیر لگے اسے آنے میں۔ وہ سوچ رہا تھا.....

سڑک پہ کھڑا خاور بہت امید سے اس گھر کو دیکھ رہا تھا۔ ذہن کے کسی نہاں خانے میں یہ خیال آیا کہ ہو سکتا ہے ہاشم اس کو صرف اس لئے دوبارہ رکھنے پہ مجبور ہوتا کہ وہ گواہی دے ڈالے۔

ہاشم اب صوفے سے اٹھا اور ایک دفعہ پھر کلائی پہ بندھی گھڑی دیکھتے ہوئے ڈرائنگ روم میں ٹہلنے لگا۔ دائیں سے بائیں۔ بائیں سے دائیں.....

”نہیں!“ خاور نے دور نظر آتے بنگلے کو دیکھتے ہوئے سختی سے نفی میں سر ہلایا۔ ہاشم کو اس کی بے گناہی کا یقین آ گیا ہے۔ وہ اس کو اس کے لئے چاہتا ہے۔ وہ اس کو اس کی خدمات کے عوض واپس بلارہا ہے۔ وہ اس کا مالک ہے۔ اور اس غلامی پہ اسے فخر ہے۔ خاور کی گردن اکڑ گئی۔ دل میں سکون سا اثر گیا.....

ڈرائنگ روم میں ٹہلتا ہاشم اب سوچتے ہوئے دو انگلیاں گال کے زخم پہ پھیر رہا تھا جہاں صبح شیو کے دوران کٹ لگا تھا۔ وہ گہری سوچ میں تھا، گویا درد کا احساس نہیں ہو رہا تھا.....

خاور سڑک پہ قدم قدم آگے بڑھتا گیا۔ یہاں تک کہ بنگلے کا آہنی گیٹ آن پہنچا۔ وہ کھلا تھا۔ کوئی ملازم، کوئی گارڈ نہ تھا، اور ایسا صرف تب ہوتا تھا جب گھر کا کوئی فرد وہاں ہوتا تھا۔ خاور ہلکا سا مسکرایا۔ اپنا سیت سی محسوس ہوئی۔ اس خاندان کو وہ کتنے اچھے سے جانتا تھا۔ ہاشم ابھی تک دائیں سے بائیں چکر کاٹ رہا تھا، جب وہ رکا۔ ہا ہر لابی سے بولنے کی آواز آرہی تھی۔ بڑھتے قدم سنائی دے رہے تھے۔ ہاشم نے گہری سانس لی۔ بالآخر...! انتظار ختم ہوا.....

خاور بنگلے کے برآمدے تک آ پہنچا تھا۔ اسے اب کسی کا ڈر نہ تھا۔ ہاشم کی آواز کا وثوق، یقین، مان...! اسے اس پہ بھروسہ تھا۔ اس نے مرکزی دروازہ کھول کر دھکیلا۔ لکڑی کا پٹ چڑھتا ہوا دوسری طرف جا لگا۔ اندر روشنی تھی مگر سامنے کوئی نظر نہ آتا تھا۔ خاور سر سے اونٹنی ٹوپی اتارتا اندر داخل ہوا...! اسی لمحے پیچھے سے اس کی گردن میں کوئی نوکیلی شے آ کر لگی۔ وہ بے یقینی سے واپس پلٹا، مگر ٹریکولائزر ڈارٹ کا اثر روشنی کی رفتار سے اس کے رگ و پے میں سرایت کرنے لگا۔ وہ لڑکھڑا کر نیچے گرا۔ گھٹنوں کے بل، بے یقین، دنگ چہرہ اٹھایا تو دھندلا سا نظر آیا۔ سامنے سنگدوم سے کوئی چلتا آرہا تھا..... خاور نے پلکیں جھپکائیں۔

”ہاشم!“ لمبوں سے بدقت نکلا مگر وہ دیکھ سکتا تھا کہ آنے والا ہاشم نہ تھا۔

”ہیلو کرنل خاور۔ مجھے امر شفیق کہتے ہیں۔ اور رہے ہاشم صاحب تو وہ اس وقت اسلام آباد میں ہیں...! اور ان کو اپنی بیوی اور بیٹی کے ساتھ سوئی کی دوست کی سالگرہ میں شرکت کرنے جانا ہے۔“

ادھر اسلام آباد میں شہرین کے گھر کے سنگ ایریا میں ٹہلتا ہاشم آوازیں سن کر ٹھہر گیا تھا۔ دفعتاً دروازہ کھلا اور دو ملازموں کے ہمراہ شہری اور سونی آتی دکھائی دیں۔ دونوں بھی سنوری اور خوبصورت لگ رہی تھیں۔ سونی بابا کہتے ہوئے فوراً سے اس کی طرف بھاگی۔

”اتنی دیر لگا دی تم نے۔ میں کب سے انتظار کر رہا تھا۔“ وہ سونی کو اٹھا کر اس کے گال چومتا بظاہر مسکرا کر مگر درحقیقت دبے دبے غصے سے شہری سے بولا تھا۔

”میری اسٹانکسٹ کی وجہ سے دیر ہوئی ہے۔ اب چلیں۔“ وہ بے نیازی سے کہہ کر اپنا سیل فون بیک میں ڈال رہی تھی۔ وہ سونی کو اتار کر اس کے قریب گیا۔

”اسندہ اس طرح کے دھوٹے قول کرنے سے پہلے مجھ سے پوچھا کرو۔“

شہری نے اچنبھے سے مسکرا کر سہلے آنکھیں اٹھا کر اسے دیکھا۔ ”کیوں؟“

”کیونکہ لوگ ہمارے بارے میں۔ شہر کے بارے میں باتیں کر رہے ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ سونی کچھ سنے۔“ وہ دبی آواز میں گھر کر بولا تھا۔

”ایسے کام کرنے سے پہلے سوچا کرو نا۔“ وہ ناک سکوڑ کر بولی آگے بڑھ گئی۔ وہ جو کوفت زدہ کھڑا تھا سونی کے خود کو دیکھنے پہ مسکرایا اور اس کے ہمراہ دروازے کی طرف بڑھ گیا۔

خاور کی آنکھ کھلی تو منظر چکراتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ اس نے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھنا چاہا، مگر... دھند سی دھند تھی۔ نمی سی نمی تھی۔ وہ کرسی سے بندھا ہوا تھا۔ ڈکٹ ٹیپ سے۔ کہنیوں سے گھٹنوں تک سلور ٹیپ لپیٹ لپیٹ کر اس کو جکڑا گیا تھا۔ اس نے آنکھیں بار بار جھپکتے گردن جھکائی۔ سخت سردی میں وہ بغیر سویٹر حتیٰ کہ بغیر شرٹ کے بیٹھا تھا۔ جینز جو تے جرابیں سب اسی طرح پہنے ہوئے تھے مگر کندھے پر ہنہ نظر آتے تھے۔ اس نے پھر سے چہرہ اٹھایا۔

آج بھی سامنے... دور... ایک مرد اور عورت کھڑے تھے... مگر آج وہ فوڈی ایور آفٹر کے کچن میں دشمن کے سامنے قید نہیں کھڑا تھا۔ آج مقابل اپنے تھے۔

”ہاشم!“ اس کے لبوں سے پھنسا پھنسا سا کلا آنکھوں میں دل و دماغ میں ابھی بھی بے یقینی تھی۔

”ہاشم کے فرشتوں کو بھی نہیں معلوم کہ تم کہاں ہو خاور!“ مسکراتی ہوئی جواہرات آگے چلتی آئی۔ اہروہیں کھڑا رہا۔ ہاتھ باندھے۔ خاموش۔

”ہاشم نے... مجھے بلایا تھا۔“

”ہاشم نے تمہیں نہیں بلایا تھا۔“ وہ شیرنی کی سی آنکھیں اس پہ جمائے مسکرا کر بولی تھی۔ اہر قدم قدم چلتا سامنے آیا۔

”وہ کال میں نے کی تھی۔ ہاشم کی چند ریکارڈنگز سے الفاظ تو ٹوڑ کر نکالے ان کو جوڑا اور تمہیں سنوایا، کرل خاور۔ کمال طریقہ تھا۔“

اور تمہارا ہی تھا۔ تم سے ہی سیکھا ہے۔ ایسے ہی کبھی تم نے زمر کو بھی کال کیا تھا نا۔ کال پہ کسی اپنے کی پورے یقین سے کہی ہوئی بات پہ سب یقین کر لیتے ہیں۔ آج تم نے بھی کر لیا۔“ وہ کہہ رہا تھا اور خاور... اس کی مندی مندی آنکھیں سوچ سے مزید سکر رہی تھیں۔

”مارنا.... مارنا چاہتے ہو تم لوگ مجھے؟ تاکہ تم.... تم میری جگہ لے لو۔ اور آپ.... اس نے سرخ آنکھوں کا رخ جواہرات کی طرف پھیرا۔“ میں تہیہ کر چکا تھا ہاشم کو سب بتا دوں گا۔ سعدی یوسف گواہی دے گا۔ پھر وہ مان جائے گا کہ تم نے.... جواہرات کا ردار.... تم نے مارا تھا اپنے شوہر کو۔“

جواہرات کی مسکراہٹ میں کوئی تہدیلی نہ آئی۔ امر بھی پاٹ چہرہ لئے کھڑا رہا۔

”میں سمجھ گیا تھا۔ قید میں اتنے دن رہ کر میں سمجھ گیا تھا۔ تم تمہیں اس رات ان کے ساتھ۔ اور اگر تم مجھے زمین بھر سونا بھی پیش کرو میں تب بھی ہاشم کو ضرور بتاؤں گا اور اگر تم....“ حقارت سے امر کو دیکھا۔ ”تم مجھے مار بھی دو تب بھی مجھے فخر ہے کہ میں اپنے مالک کی وفات میں جان دوں گا۔“

جواہرات نے مسکرا کر امر کو دیکھا اور پھر باہر نکل گئی۔ امر اس کے پیچھے آیا۔ باہر شام گہری تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ جھلملاتے ہوئے تارے افشاں کی طرح بکھرے تھے۔

برآمدے میں کھڑے جواہرات نے سنجیدگی سے اسے دیکھ کر کہا۔

”اس کو خاموش کروانا ضروری ہے۔ کر لو گے نا؟“

”آپ فکر نہ کریں جواہرات!“ اس نے سر کو خم دے کر کہا۔ پھر ملکہ کی آنکھوں پہ نظریں جمائے پورے یقین سے بولا۔ ”اتنا بوجھ دل پہ لے کر نہ پھرا کریں مادام۔ اگر راز شیر کیا ہے تو مجھ پہ بھروسہ بھی کریں۔“

”بھروسہ تھا تو بتایا ہے نا!“ اس نے جھرجھری لی۔ ”اب میرے سر کا تاج بہت بھاری ہوتا جا رہا ہے۔“

”میری بات سنیں دھیان سے۔“ اس نے آگے بڑھ کر مضبوطی سے جواہرات کے شانوں کو تھاما۔ ”اس بات سے نہ ڈریں کہ ہاشم اور نوشیرواں یہ جان جائیں گے تو کیا ہوگا؟ بلکہ اس دن کی تیاری کرنی ہے ہمیں۔ آپ نے... ایک اچھا کام کیا تھا۔ وہ آدمی ایک درندہ تھا اور درندے کو مار کر آپ نے اپنے بیٹوں کو بچایا تھا۔ آپ نے اپنے بیٹوں کے لئے قربانی دی تھی۔“

جواہرات کی آنکھوں میں نمی در آئی۔ ”وہ دونوں مجھے کبھی معاف نہیں کریں گے۔“

”تو میں کس مرض کی دوا ہوں؟“ وہ برا مان کر بولا تھا۔ ”ہم مل کر اور نگریب کاردار کے ایسا ایسے کالے کر تو ان کے سامنے لائیں گے ان کے کردار کو اتنا مسخ کر دیں گے ان کے خلاف اتنا زہرا گلیں گے کہ وہ دونوں ان سے نفرت کرنے لگ جائیں گے اور اگر کبھی ان کو معلوم ہو بھی جاتا ہے تو وہ آپ کی پوزیشن سمجھ جائیں گے اور یہ سوچیں گے کہ اچھا ہی ہوا ان کو نجات دلا دی۔ آپ نے۔“

جواہرات کے لب مسکراہٹ میں ڈھلے۔ آنکھ سے ایک قطرہ ٹوٹ کر گال پہ لڑھکا۔ ”کیا ایسا ممکن ہے؟“

”یہ بھی تو ممکن نہیں لگتا تھا۔ آج یہ در در بھی ختم ہو جائے گا۔“ اس نے مسکرا کر ہنسلے کی طرف اشارہ کیا۔ وہ مسکرا کر رہ گئی۔

جواہرات کا درکار کے جانے کے بعد وہ اس تہا پڑے ہنسلے کے اندر آیا۔ کچن میں فریج سے ایک ہا کس نکالا اور اس کمرے میں آیا جہاں خاور بندھا پڑا تھا۔ اہر نے مصروف سے انداز میں ڈکٹ ٹیپ کا ایک بڑا ٹکڑا کاٹا۔

”اب کیا مجھے مار کر پھینکنے کا ارادہ رکھتے ہو؟ ہونہ۔ یہ کاردارز میرے نہیں ہوئے تمہارے کیا ہوں گے۔“ اس نے تنفر سے سر جھٹکا تھا۔ اہر اسی طرح آگے آیا اور ڈکٹ ٹیپ کا ٹکڑا اس کے منہ پر رکھ کر زور سے چپکا دیا۔ وہ سر جھٹک کر رہ گیا۔

”میں تمہاری بک بک تمہارے OMG's اور ”کیا کیوں کیسے“ نہیں سننا چاہتا ان باتوں پہ جواب میں تمہیں بتانے جا رہا ہوں اس لئے کتنا اچھا ہو کہ تم یوں چپ ہو کر بیٹھو۔ خاموش اور بے بس! ہاں ایسے ٹھیک ہے۔“ سامنے آ کر سر اہتی نظروں سے اس منظر کو دیکھا پھر واپس اپنی کرسی پہ آ بیٹھا اور ہا کس کھولا۔ اندر مختلف شیشیاں چند کاغذ اور چند سرنجیں رکھی تھیں۔

”تم نے کبھی ہیری پوڈر پڑھی ہے خاور؟ سوری میں ایسے موقعے پہ اس داستان سے کچھ منقول کر رہا ہوں اب جب کہ تم اپنی یہ خوبصورت زندگی کھونے والے ہو یونہی۔“ ایک سرنج کی سوئی شیشی میں چھو کر وہ اسے اوپر اٹھائے بھر رہا تھا۔ ”مگر اس میں ایک ٹرم استعمال ہوتی تھی۔ اس کا پہلا پیپر اسی نام سے ہے۔ **The Boy Who Lived**۔ وہ لڑکا جو زندہ بچ گیا۔ اون سروائیور۔“ پھر نگاہیں اٹھا کر ان میں زمانوں کی تپش بھر کر خاور کو دیکھا۔ ”کہتے ہیں انتقام کے سائیکل میں ہمیشہ ایک سروائیور بچ جاتا ہے اور وہ انتقام لیتا ہے یوں چکر پہ چکر چلتا رہتا ہے.... چلتا رہتا ہے.... میں.... کرل خاور.... میں ہوں وہ لڑکا جو بچ گیا تھا!“

خاور کا منہ ٹیپ سے بند تھا مگر کھلی آنکھوں میں اچنبھے اور حیرت کے سارے الفاظ سمٹ آئے تھے۔

”وہ بریگیڈئیر یا وہ تمہیں کرل خاور جس کو اس کے پورے خاندان سمیت تم نے قتل کیا تھا؟ تمہیں شک تھا کہ امریکہ میں اس کی ایک اور اولاد بھی ہے کسی دوسری عورت سے جسے وہ چھپا کر رکھتا ہے اور تمہیں یقین تھا کہ وہ بیٹی ہوگی، مگر تم غلط تھے۔ وہ بیٹا تھا۔ سلطان بخش۔ اور وہ میں تھا!“ اس نے شیشی سرنج کی سوئی سے نکالی جھک کر کاغذ سے کچھ پڑھا پھر دوسری شیشی اوپر اٹھا کر سوئی اس میں گھسا کر احتیاط سے مائع ساسرنج کے لیٹن میں بھرنے لگا۔

خاور کی آنکھیں پھیل گئی تھیں اور وجود بالکل ساکت ہو گیا تھا۔

”جب تم نے میرے باپ اور میری باف فیملی کو قتل کیا تھا تو میں ایک ٹین ایج لڑکا تھا جو یورڈنگ اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ میرا باپ اپنی حساس جاب کے باعث اپنی اولاد اور خاندان والوں کے ویراباؤٹس مخفی رکھتا تھا، لیکن تم اس رات ہمارے گھر گئے جب سب وہاں موجود تھے چھٹیوں پہ سب آئے ہوئے تھے۔ میں نہیں تھا۔ سو میں بچ گیا۔ ابا کے رشتے داروں نے ساری پر اپنی ہتھیالی اور ابا کے دوستوں نے مجھے واپس آنے سے روک دیا۔ وہ کہتے تھے سلطان تم بھاگ جاؤ، چھپ جاؤ۔ وہ آدمی تمہیں ڈھونڈ رہا ہے۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ آدمی کون تھا۔ میں اتنے برس ایک اُن دیکھے دشمن سے چھپتا رہا۔ بھاگتا رہا۔ شہر بدلے اسکول بدلے پھر جاب بدلی اور اس برسینے کے اول

بدل نے مجھے امر شفیق بنا دیا۔ Con Man۔ ”وہ احتیاط سے شیشی اوپر اٹھائے قطرہ قطرہ اٹھائے سرخ میں بھر رہا تھا۔ نظریں اوپر سرخ کے بھرتے پیٹ پہ جمی تھیں۔

خاور کا چہرہ سرخ تھا، آنکھوں میں خون اتر آیا تھا، وہ سختی سے نفی میں سر ہلاتا خود کو چھڑانے کی کوشش کر رہا تھا، مگر گرفت مضبوط تھی۔ ”میسوں کی محنت اور کھوج نے مجھے اتنا بتا دیا کہ ساری گتھیاں اور نگزیب کاردار کے گرد جا کر کھلتی ہیں۔ میں نے خون کو ان سے متعارف کروایا، ایسے کہ وہ مجھے ملازمت کی پیشکش کریں۔ Con Man کبھی کبھی نہیں مانگتا، وہ ایسے مواقع پیدا کرتا ہے کہ آپ کو لگے یہ سب آپ کا ہی آئیڈیا تھا۔ وہ خود ہی مجھے سب دیتے گئے۔ اور ان کے پاس اتنا عرصہ کام کر کے جانتے ہو مجھے کیا معلوم ہوا؟ وہ سب جو تمہیں خود نہیں معلوم!“

شیشی رکھی، کیس بند کیا اور سرخ پکڑے اسٹول اٹھائے اس کے سامنے آکر اسٹول رکھا اور اس پہ بیٹھا۔ پھر اس کی خون آشام آنکھوں میں دیکھ کر سادگی سے بولا۔

”تم نے ہاشم کے کہنے پہ زمر یوسف کو زخمی کیا، اس سے اس کے تمام رشتے چھینے اس کی شادی کینسل کر دانی اس کا ہر راستہ بند کیا۔ ایسے یہ ہر راستہ بند کرنے والا کام.... یہ کاردار نے پہلی دفعہ زمر کے ساتھ نہیں کیا تھا۔ چند برس پہلے جب جواہرات کاردار اور ہاشم کاردار کے سکیورٹی ہیڈ کا انتقال ہوا تھا تو انہوں نے سوچا کیوں تا ایک نیا سکیورٹی ہیڈ ڈھونڈا جائے؟ پھر اسے تراشا جائے۔ پھر اس کا ہر راستہ بند کیا جائے تاکہ وہ ان ہی کا ہو کر رہ جائے؟“ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر وہ چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ خاور کا مزاحمت کرنا وجود ٹھہر گیا۔ ساکت۔ ساکن۔

”یہ بڑے لوگ ایسی بڑی بڑی پوسٹیں دینے سے پہلے امیدوار کا ہر راستہ ہر دروازہ بند کرتے ہیں۔ انہوں نے آٹھ ماہ تم پہ انویسٹ کیا۔ ایک بہادر دلیر اور زیرک کرنل پائرام لگوا دیا، پھر اسی کے مدعی بن کر وکیل بن کر اس کی عدالت سے چھڑوایا اور پھر....“ اس کی آواز یا سیت سے دھیمی ہوئی۔ خاور سکتے میں تھا۔ ”اور پھر ہاشم کاردار اور جواہرات کاردار نے تمہارے بیٹوں کو مروایا، کیونکہ تم بری ہونے کے بعد ملک سے باہر جانے کا سوچنے لگے تھے۔ یہ کافی نہیں تھا۔ ان کو ایک وفادار آدمی چاہیے تھا۔ جس کا کوئی ندر ہے اور ان کا ہو کر رہے۔ اور الزام ڈالا انہوں نے میرے باپ پہ۔ کرنل خاور میرا باپ ایک ایماندار اور اچھا آدمی تھا۔ وہ تمہیں گرفتار ضرور کرنا چاہتا تھا مگر اس نے تمہارے بیٹوں کو نہیں مارا تھا۔ ان کو جواہرات کاردار نے مروایا تھا۔ یہ سارے مافیا باز، یہ ایسے ہی ڈھونڈتے اور تراشتے ہیں اپنا دایاں ہاتھ۔ انہوں نے تمہیں تراشا اور جب تم نے اپنی زندگی کے پہلے قتل کر ڈالے تو وہ تمہاری سب سے بڑی سپورٹ بن کر سامنے آ گئے۔ انہوں نے تمہیں اپنی چھایا تلے لے لیا۔ اور تم ان کے کہنے پہ ساری زندگی دوسروں کو قتل کرتے آئے، زندگیاں برباد کرتے آئے۔ ان کے کہنے پہ جنہوں نے تمہارے بچوں کو مروایا تھا۔ اور دھینا ان کے پاس اس عمل کی بھی جسٹی فکیشن ہوگی۔ تم حیران تھے کہ ہاشم نے کیوں یقین کر لیا کہ تم نے اور نگزیب کاردار کو مارا ہوگا؟ کیونکہ اسے لگتا تھا ان کی حقیقت جان گئے ہو مگر اور نگزیب کو قصور وار سمجھتے ہو۔ وہ یہی پوچھتا تھا تم سے اتنے ماہ۔

وہ یہی جانتا چاہتا تھا کہ تم کیا جانتے ہو۔ میں اپنی باتوں کا کوئی ثبوت تمہیں نہ بھی دوں، تب بھی جب ان کو سوچو گے تو خود ہی ساری کڑیاں ملتی جائیں گی۔ سب واضح ہو جائے گا۔“ اہمراستول سے اٹھ کھڑا ہوا۔

خاور اسی طرح سستے کے عالم میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ مگر وہ نیچے فک نہیں رہے تھے۔ وہ بھی ساکت تھے۔ اہمراستول کے پیچھے جا کھڑا ہوا تھا۔

”تمہارے پاس چوائس تھی، تم ہاشم کے پاس واپس آنے کی بجائے عدالت چلے جاتے، اس کے خلاف گواہی دیتے، لیکن تم نے وہی کیا جو تمہاری خصلت تھی۔ اگر تمہارے اندر کوئی خیر ہوتی تو میں تمہیں چھوڑ دیتا تو تم خود بھی اس رات فوڈلی ایور آفٹر کے کچن میں اس عورت پہ پستول نٹانتے جس نے فارس کو ٹھنڈا کر کے تمہاری جان بچائی تھی۔ مگر وہ کیا ہے خاور کہ میں ان جیسا نہیں ہوں۔ نہ میں تمہارے جیسا ہوں۔ میں وہ نہیں کروں گا جو تم سمجھ رہے ہو کہ میں تمہارے ساتھ کرنے جا رہا ہوں۔ ایک تیز ہٹارو کے موت؟ کیا تمہیں واقعی لگتا ہے اتنا رحم میں تمہارے اوپر کھاؤں گا!“

اور خاور کو محسوس ہوا کہ اس کے برہنہ کندھوں پہ اہمراستول نے گلہ والے ہاتھ رکھے ہیں اور پھر.... گردن کے نیچے.... قدرے نیچے.... سوئی کی نوک چھبی.... درد.... تکلیف.... اور پھر.... جیسے ہر شے را کھ کا ڈھیر بن گئی۔ یہ وہ دن تھا جب کرنل خاور مظاہر حیات کی ”زندگی“ کا باب ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دلوں کی روشنی بجھنے نہ دینا

وجود تیرگی محکم نہیں ہے

سبز بیلوں سے ڈھکے مورچال کی بالائی منزل کی کھڑکیوں سے مارچ کی ٹھنڈی دھوپ سیدھی ٹکر رہی تھی۔ اندر جھانک تو کرے ٹھنڈے لگتے تھے۔ ایسے میں حسین کا کمرہ عجیب نمونہ پیش کر رہا تھا۔ فرنیچر جو دیواروں سے لگا تھا ذرا آگے کھسکا کر چادروں سے ڈھک دیا تھا اور کونے میں ایک چھوٹی میٹر می سی رکھی تھی۔ فرش پہ نیچے ایک بڑی بالٹی ایک اور دو پینٹ کے ڈبے رکھے تھے۔ وہ خود عام شلواری قمیض پہنے بالوں کو کشمیری انداز میں اسکارف میں لپیٹے، آستین پیچھے چڑھائے میٹر می کے اوپر کھڑی تھی اور سوکھے برش کو بازو اونچا کر کے چھت سے ٹکرانے کی کوشش کر رہی تھی۔

”میرا ہاتھ جارہا ہے میں دیوار کے اوپری کونے تک پینٹ کر لوں گی۔“ اس نے چپک کر اطلاع دی۔ نیچے فرش پہ آلتی پالتی کیے بیٹھے اسامہ نے بہت ضبط سے کھنکار کر اس کی توجہ لی۔

”حنہ، یہ تم کل شام کیا اچانک سے ریٹورانٹ کے نیچے ہوئے ڈبے لے آئی ہو اور اب کہہ رہی ہو کہ تم نے پینٹ کرنا ہے کمرہ۔“ حنہ نے گردن گھما کر نیچے بیٹھے اسامہ کو نگلی سے دیکھا۔ ”تم کیا جانو اداک کا مزہ۔ جتنی ہوم ڈیکور کی ویب سائٹس میں نے دیکھی ہیں نا“

پتہ ہجان کے کمرے ساتنے خوبصورت کیوں ہوتے ہیں؟ کیونکہ ان میں یہ سفید چٹا پینٹ نہیں ہوتا۔ گھرے ہمیشہ اپنی دیواروں کو Tint ضرور دیتے ہیں۔ دروازے وہ سفید رکھتے ہیں۔ ہمارے ہاں الٹا حساب ہے۔“ ناک سکوز کروہ واپس دیوار کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مگر حنہ یاد ہے جب ریستورانٹ پینٹ ہوا تھا؟ وہ لوگ ایسے ہی منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کر لیتے تھے بلکہ پہلے دیوار پہ کچھ رگڑتے تھے اور بھی بہت کچھ کرتے تھے۔ تم نیٹ پہ پینٹ کے ٹیوٹوریل کیوں نہیں پڑھ لیتی؟“ سم نے ہار نہیں مانی تھی۔

”میں نے کوشش کی تھی وہ اتنے لمبے چوڑے اسباق دہرا رہے تھے میں نے چھوڑ دیئے ایویں گھر دوں کے غرے، یہ کروہ کرو۔ اس طرح تو بندہ سال بھر کمرہ ہی تیار کرتا رہے۔ پینٹ کب کرے؟“ پھر لا پر واپس سے سر جھٹکا۔ ”میں تو ایسے ہی کروں گی پینٹ۔ یہ کون سا مشکل ہے۔ بس برش کو پینٹ میں ڈبو کر دیوار پہ اوپر نیچے لگاتے جاؤ۔ واؤ۔“ آنکھیں میچ کر اس نے وہ کارٹون یاد کیے جن میں یونی مزرے سے پینٹ ہو جاتا تھا۔ ”اور پھر دیکھنا، کتنا خوبصورت رنگ چڑھے گا۔“

”مگر کیا وہ رنگ دیر پا بھی ہوگا؟“ چوکھٹ میں قدموں کی آواز آئی اور پھر اس کی آواز۔ حنین وہیں ٹھہر گئی۔ برش والا ہاتھ نیچے گرا دیا۔ مڑی نہیں۔ ساکت کھڑی رہی۔ اسامہ جو نیچے بیٹھا تھا وہ بھی نہیں ہلا بس سر جھٹکا دیا۔ وہ سعدی سے ابھی تک نظریں نہیں ملا سکتا تھا۔

”گھرے ایک بہت اچھی بہت قابل قوم ہیں اور جب وہ کہتے ہیں کہ یوں منہ اٹھا کر پینٹ نہیں کرتے تو وہ صحیح کہتے ہیں۔ وہ ہماری طرح سست اور کام چور نہیں ہوتے۔ اپنا ہر کام خود کرنے اور احسن طریقے سے کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔“ وہ گردن اٹھائے حنین کے کمرے کی دیواروں کو دیکھتا دیکھتے لمبے لمبے میں کہہ رہا تھا۔ اسامہ اور حنین اپنی جگہ چپ تھے۔ ساکت۔ جامد۔

”خوبصورت رنگ ایسے نہیں چڑھ جاتے۔ ان کے لئے بہت محنت کرنی پڑتی ہے۔ جان ماری پڑتی ہے۔ ایک ایک بات کا خیال رکھنا پڑتا ہے یہ دیواریں۔۔۔ یہ گھر کی دیواریں اپنے اوپر کسی اجنبی رنگ کو ایسے ہی نہیں چڑھنے کی اجازت دے دیتیں۔“ وہ بنوز گردن اونچی کیے سادگی اور نرمی سے کہہ رہا تھا۔ اس کی طرف کمر کیے اونچائی پہ کھڑی حنین کی آنکھوں کے کٹورے لباب بھرتے گئے۔ مگر لب ایک دوسرے میں سختی سے پیوست کر کے ضبط کیا۔ سم کا چہرہ جھکا ہوا تھا۔

”دوسری کسی بھی چیز کو رگڑ دو وہ خراب ہوتی ہے اس کی چمک اور خوبصورتی ماند پڑ جاتی ہے۔ مگر دیواروں کی نہیں۔ گھر کی دیواروں کو رگڑیں کھانی پڑتی ہیں۔ سخت ریگ مال سے ان کو رگڑ رگڑ کر چھلنی کیا جاتا ہے، مگر یہ ہر رگڑ کے بعد پہلے سے زیادہ smooth ہو جاتی ہیں، پھر ان کے سوراخ اور دراڑیں بھری جاتی ہیں۔ فلر سے ان کے زخموں کو مرہم لگایا جاتا ہے۔“

حنین نے آنکھیں بند کر لیں۔ آنسو پٹ پٹ گرتے چلے جا رہے تھے۔ سم سر جھٹکائے ہوئے سسک رہا تھا۔ چوکھٹ میں کھڑا لڑکا جس کے بال اب پہلے جیسے چھوٹے نہ رہے تھے اور قدرے بڑھنے کے باعث ان کا اصل قدرتی ٹھنکریلا پن نظر آنے لگا تھا اسی طرح ملاحت سے بول رہا تھا۔

”ان دیواروں کو بھی اتنا رگیدنے اور رگڑنے سے درد ہوتا ہوگا، مگر یہ برداشت کر لیتی ہیں۔ جانتی ہیں کہ یہی اچھا ہے ان کے لئے۔“

پھر ان کے اوپر پرائمر (primer) پینٹ کیا جاتا ہے۔ ہمارے اسے ڈسٹنپر یا چونا وغیرہ بھی کہتے ہیں۔ گورے اس کو پرائمر یا seder کہتے ہیں۔ وہ ساری دیوار کو ڈھانک لیتا ہے۔ اس کا پردہ بن جاتا ہے۔ سارے عیوب ڈھک جاتے ہیں، پرانے پینٹ اور نئے پینٹ کے درمیان کی آڑ ہوتا ہے وہ۔ ماضی کو مستقبل پر اثر انداز ہونے سے روک دیتا ہے۔“

اونچی سیڑھی پہ کھڑی حصہ نے گردن جھکا دی۔ ہاتھ اسی طرف دیوار پہ جھٹکا اور آنسو ٹپ ٹپ کرتے جا رہے تھے۔
 ”وہ پرائمر پینٹ اگر نہ لگایا جائے تو نئے آنے والے ہر پینٹ کو دیوار کے پلستر کی دیوار اپنے اندر جذب کر لیتا ہے۔ اس مستقبل کے ہر رنگ کو ماضی کے سوراخ کھا جاتے ہیں۔ لیکن اچھے سے پرائمر لگا دو تو اوپر جو رنگ بھی کرو۔ وہ ایسا خوبصورت چڑھے گا کہ سارا گھر چمک اٹھے گا۔ پھر زمین سے رس رس کر خراب چورہ اڑوں سے داخل ہوتے پانی سے بھی دیواریں خراب نہ ہوں گی، نہ موسم اثر کرے گا، نہ کسی کا میلا ہاتھ گدلا کر سکے گا اس رنگ کو۔ گھر کی دیواروں کے ایسے پکے اور خوبصورت رنگ یونہی نہیں آ جاتے۔ ان کے لئے بنیاد کو ایک دفعہ تو چھلنی کرنا پڑتا ہے۔“

حمین نے برش کہاں گرایا، وہ کیسے سیڑھی سے جست لگا کر اتری، اسے نہیں علم۔ بس وہ روتی ہوئی دوڑتی ہوئی آئی اور سعدی کے گلے لگ گئی۔

”بھائی، آئی ایم سو سوری۔ آپ کا قصور نہیں تھا۔ بھائی آئی ایم سو سوری۔“

سیم بھی ایک دم اٹھا اور بھاگ کر ان دونوں کے گرد بازو جمائے کیسے سعدی کے کندھے سے لگ گیا۔ وہ بھی روئے جا رہا تھا۔

”بھائی میرا وہ مطلب نہیں تھا۔ مجھے ایسا نہیں کہنا چاہیے تھا۔ پلیز آپ دوبارہ مت جانا۔“

وہ دو چھوٹے چھوٹے بچے تھے جن کے صرف قد بڑے ہو گئے تھے۔ سعدی ان دونوں سے اونچا تھا اس کے بازو دونوں سے زیادہ مضبوط تھے۔ وہ دونوں کے گرد بازو جمائے کیسے بیک وقت دونوں کو تھپک رہا تھا۔ اس کے چہرے پہ نرمی، آنکھوں میں نرمی اور لبوں پہ مسکراہٹ تھی۔

”مجھے بھی تم سے لڑنا نہیں چاہیے تھا۔ ایک غلطی کے پیچھے مجھے یہ نہیں بھولنا چاہیے تھا کہ جہاں کتنے لوگ بزدلی سے میرے معاملے سے جان بچا کر نکل گئے اور کتنے لوگ صرف لالچ میں میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں وہاں اتنے ماہ تم لوگ میرے لئے کھڑے تھے!“

مگر وہ دونوں اس کو بولنے نہیں دے رہے تھے۔ حمین روتے ہوئے لٹی میں سر ہلاتی بولے جا رہی تھی اور سیم اس کے کندھے پہ ہاتھ ٹیکے ہچکیوں کے دوران کہہ رہا تھا.....

”بھائی آپ کا حق تھا مجھ سے لڑنے کا۔ میں نے غلط کیا تھا۔ اس میں آپ کا کوئی قصور نہیں تھا۔ سب سے زیادہ سرفرا (suffer) آپ

نے کیا تھا۔“

”بھائی میں کبھی آئندہ یوں نہیں بولوں گا۔ حصہ سے لڑنے کا حق تھا آپ کو۔ وہ ہماری برادری کی بہن ہے۔ موٹی، کالی، بد صورت ہے تو کیا

ہوا وہ ہماری برادری کی بہن ہے۔ مجھے درمیان میں نہیں آنا چاہیے تھا۔ اور سیم یہ سب بچوں کی طرح ہلکتے کہہ رہا تھا۔ وہ اس کا سر تھپکتے تھپکتے ہنس دیا تھا مگر حسین نے تو جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”ہم نے بھی اتنا نہیں سوچا کہ آپ کو اتنے ماہ خوشی کا ایک لمحہ بھی نہیں ملا۔ ہمارے پاس تو پھر بھی خوشی کے مل بیٹھنے کے لمحے آئے تھے، مگر آپ نے سفر کیا سب سے زیادہ۔“

”اور میں یوں بولا بھائی جیسے آپ کسی لکڑی ٹرپ سے لوٹے ہیں۔ مجھے یوں نہیں....“ وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ لگے نیچے بیٹھ گئے تھے۔ وہ ”کوئی بات نہیں۔ آئندہ ہم ان باتوں کو اپنے درمیان نہیں آنے دیں گے“ بار بار یہی بات دہراتا جا رہا تھا، کبھی جھک کر حنہ کا ماتھا چومتا، کبھی سیم کے بال سہلاتا۔ وہ بڑا تھا۔ اسے ہی تسلی دینی تھی۔ اسے ہی زیادہ طرف کا مظاہرہ کرنا تھا۔ بڑوں کی قربانیاں بھی بڑی ہونی چاہئیں نا۔

مورچال کے باہر دھوپ ڈھلتی گئی یہاں تک کہ بنگلے پہ چھایا سی تن گئی۔ اب حنہ کی کھڑکی سے جھانکنا وہ تینوں چوڑی مارے فرش پہ بیٹھے تھے۔ درمیان میں کوک سے بھرے تین گلاس، کوک کی بڑی بوتل اور چند ڈبے کھلے پڑے تھے جن میں سے بزرگ اور فریج فرائیز جھلک رہے تھے۔ سعدی سر جھکائے کوک کے گلاس میں اسٹرا ہلاتا دھیرے دھیرے سے بول رہا تھا اور وہ دونوں کھاتے ہوئے سن رہے تھے۔ ”ہاشم سمجھا ہم باہر پر اپرا کے جھوم میں گم ہونے والے ہیں سو اس کے سارے بندے اسی طرف بھاگے، مگر ہم ایک ہاتھ روم کے نیچے مین ہول سے سرنگ میں اترے۔ اور وہاں سے....“ اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا.... ”سیدھا باہر دو گلیاں چھوڑ کر سڑک پہ نکل آئے۔“ سر جھکائے بولتے اس کے چہرے پہ یاسیت تھی۔

”واؤ!“ سیم بزرگ کا بھاری نوالہ منہ میں چبانا آنکھیں پھیلا کر بولا تو حسین نے آنکھیں دکھائیں۔ (مولے آلو چپ کرؤ وہ تمہیں تکلیف دہ واقعے کا منظر نامہ بتا رہا ہے، کسی ایڈوانچر کا نہیں۔) سیم نے جلدی سے نوالہ لنگتے ہوئے چہرے پہ مسکینیت طاری کی۔ ”اوہ!“ سعدی اس کے بدلے لالہ انداز پر نرمی سے مسکرا دیا اور کہنے لگا۔

”پھر ہم وہاں سے ایک ٹک ٹک میں بیٹھا اور....“

”پتہ ہے بھائی، کتنا اچھا ہوتا اگر آپ مسز کاردار کو پرغمال بنا کر ساتھ لے آتے۔ چوبیس گھنٹے بعد جو میک اپ اترنے سے ان کی حالت ہوتی....“ حنہ خود بھی اندہ سکی۔ بول کر ہنسی چلی گئی۔ سعدی نے ہاتھ اٹھا کر اس کے سر پہ ہلکا سا تھپڑ لگایا۔

”یوں کرو تم بول لو میری خیر ہے۔“

”اللہ! میں نے کیا کیا ہے!“

اور زمر جب بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آئی تو اس نے دیکھا وہ تینوں اسی طرح ایک ساتھ بیٹھے بزرگ زکھارے تھے اور ایک دوسرے کو لقمے دے رہے تھے۔ چہروں پہ سوکھے آنسوؤں کے نشان ابھی بھی موجود تھے اور لبوں سے مسکراہٹیں پھوٹ رہی تھیں۔

”سعدی!“ زمر نے دھیرے سے دوازے پہ دستک دی۔ تینوں نے سر گھما کر دیکھا۔ حہ نے فوراً بڑھایا مگر وہ مسکرا کر نفی میں سر ہلاتی کام کی بات پوچھنے لگی ”انٹرویو کا کیا پتا؟ فارس نے کچھ بتایا ہی نہیں۔“

”انٹرویو۔ ہونہ۔“ سعدی نے سر جھٹکا۔ ”میں لاکھ مانگ رہا تھا وہ انکر۔ اور فارس ماموں کو دیکھیں، خود کہا تھا کہ تمہارے ساتھ چلوں گا، مگر وہاں جا کر بالکل چپ بیٹھے رہے، اتنا نہیں ہوا کہ دوپٹہ لگا دیتے اس انکر کو۔ ایک مارنے کا کام ہی تو آتا ہے ان کو وہ بھی نہیں کیا۔“

خفگی سے واپس گردن موڑ لی۔ زمر اور حہین نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر حہ کھٹکھاری۔ ”بھائی..... فارس ماموں چپ ہوں تب بھی بہت کچھ کر جاتے ہیں۔ ان کو ہلکانہ لیں۔“

”بالکل۔“ زمر مسکراہٹ چھپاتی واپس چلی گئی۔ نیچے آئی تو وہ کچن میں بیٹھا تھا۔ موبائل پہ بٹن دبا رہا تھا۔

”مجھے تم سے بات کرنی ہے فارس۔“ اس نے کرسی کھینچی تو فارس نے نظریں اٹھائیں۔ اسے دیکھ کر مسکرایا۔

”زہے نصیب۔ آپ کو میرا نام بھی یاد ہے!“

”تھوڑا بہت تو یاد ہے۔“ وہ ہنس دی۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولی۔ ”سعدی کا انٹرویو ہونا ضروری ہے، وہ اس کے لئے بہت اپ سیٹ ہے اور.....“

”ہو جائے گا انٹرویو۔“ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ انداز میں لاپرواہی تھی۔

”مگر کیسے؟“ زمر نے گردن گھما کر اسے دیکھا۔

”پیسے دیں گے اور کیا۔ مگر اس کے لئے سعدی راضی نہیں ہے سودا کریں گے۔ کوئی اور حل ہے تو بتائیں مجھے۔“

وہ چپ ہو گئی۔ ”مگر.... کوئی اور طریقہ نہیں ہے کیا؟“ محتاط سے انداز میں پوچھا۔

”کیوں پراسیکیوٹر صاحبہ قانون پہ یقین ہے بنا آپ کو تو بس میں نے بھی تہیہ کر لیا ہے، کباب قانون نہیں توڑنا اور شریف آدمی بن کر رہنا ہے۔ ایسے مشکوک نظروں سے کیا دیکھ رہی ہیں مجھے؟ سچ کہہ رہی ہوں۔“ وہ خفگی سے کہتا ہر کی جانب بڑھ گیا۔ زمر سوچتی نظروں سے اسے جاتے دیکھے گئی۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

چند دن بعد

☆☆☆☆☆☆☆☆

چاک دامن تو خیر سل جاتا

چاکا سستی کہاں رفو کرتے

سفید دیواروں والے کمرہ عدالت میں دھوپ چھن چھن کر آرہی تھی۔ موسم ہندرج تہدیل ہو رہا تھا۔ سردی بہت کم رہ گئی تھی اور خزاں

رسیدہ درختوں پہ نئے ٹھکانے اور پتے کھانے لگے تھے۔ چوتھے کے سامنے پراسکوشن کے بیچ پڑ بیٹھی، قلم انگلیوں میں گھماتی بغور کٹہرے میں کھڑے نوشیرواں کو دیکھ رہی تھی۔ دوسری میز پر ٹیک لگا کر آرام دہ انداز میں بیٹھے ہاشم کاردار کی بنجیدہ نظریں بھی وہیں جمی تھیں۔

عزت مآب اختر مرتضیٰ صاحب بھی اسی سے مخاطب تھے اور کرسی کا رخ ذرا ترچھا کیے کاغذ سے پڑھ کر اسے چار جز بنا رہے تھے۔ وہ کٹہرے کے جنگلے پہ ہاتھ رکھے کھڑا پاٹ سا نظر آتا تھا۔ اس کے چہرے پہ زخموں کے تازہ نشان تھے اور ایک آنکھ نیلوں نیل تھی۔

”کیا آپ نے تمام چار جز سن اور سمجھ لئے؟“

”جی یور آنر!“

”کیا آپ نوشیرواں کاردار، کیس مئی 2015 کی شام پلاٹ نمبر چندرہ میں سعدی یوسف سے ملنے گئے تھے اور آپ نے ان پہ تین گولیاں چلائیں۔ پھر بوٹ کی ٹھوکروں سے ان کو زخمی بھی کیا؟“

زمر کے ساتھ بیٹھے سعدی کی چیختی نظریں شیرو کے چہرے کا احاطہ کیے ہوئے تھیں۔ نوشیرواں نے نگاہیں اٹھا کر حاضرین کو دیکھا اور پھر بلند آواز میں بولا۔ ”یہ غلط ہے۔ میں اس روز وہی میں تھا۔“

”کیا آپ تمام الزامات سے انکار کرتے ہیں؟“

”جی میں انکار کرتا ہوں۔ مجھے اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ میں بے گناہ ہوں۔“ وہ میکا کی انداز میں نیچے بیٹھے ہاشم کو دیکھ کر بولا تھا۔

”کیا آپ innocent plead کرتے ہیں۔“

”جی میں انوینٹ پلید کرتا ہوں۔“

(اس موقع پہ اگر ملزم صحبت جرم کا اقرار کر لے تو اس کے خلاف فیصلہ سنا دیا جاتا ہے اور اسی وقت سزا بتادی جاتی ہے۔ اگر وہ انکار کرے تو اسے شفاف مقدمے کا حق دیا جاتا ہے جہاں وہ استغاثہ (الزام لگانے والوں) کے ثبوت و شواہد کا دفاع اپنے وکیل کے ذریعے کرے۔)

”اوکے۔ آپ کو فیر ٹرائل کا حق دیا جاتا ہے۔ کیا آپ اپنے خلاف گواہ بنا چاہیں گے۔“ نیچے بیٹھے ہاشم نے نفی میں سر کو ہلکی سی جنبش دی۔ نظریں شیرو پہ تھیں۔

”نہیں یور آنر۔ میں خاموشی اختیار کروں گا۔“ اس نے اسی انداز میں کہا تھا۔

چند منٹ بعد باہر اہداری میں زمر اور سعدی چلتے جا رہے تھے اور جب وہ بہت دل گرفتہ سا بولا تھا۔ ”مجھے یقین نہیں آرہا جج نے کیسے اس کی ضمانت کی درخواست قبول کر لی۔ وہ اب گھر چلا جائے گا اور پھر ملک سے باہر۔“

زمر نے نگاہیں پھیر کر اسے دیکھا۔ یوں لگتا تھا وہ برسوں پہلے یونیورسٹی کے موک ٹرائل سے نکلے تھا اور وہ ہیری کے خلاف فیصلہ آنے پر شدید تھلا رہا تھا۔

”سعدی... اس کو جیل میں پھا گیا ہے اس کی جان کو خطرہ ہے، جج کو اسے جیل سے نکالنا ہی تھا۔“

”ہاشم نے اسے خود پھنسا دیا ہے۔ مجھے یقین ہے۔“

”ظاہر ہے ہاشم نے اسے پھنسا دیا ہے، سماعت سے پچھلی رات۔ مگر ہم یہ باتیں جج کو کہیں گے کہ تو ہم خود ہی جھوٹے لگیں گے۔ اس کی ضمانت ہونی ہی تھی۔“ وہ اسے تسلی دے رہی تھی۔

”اگلے ماہ کی تاریخ ملی ہے۔ کیسا نظام ہے یہ۔ ہم کتنا انتظار کریں گے۔ وہ تاریخ پہ تاریخ دیتے جائیں گے۔ زمر ایسے تو کبھی انصاف نہیں ملے گا۔“ وہ شدید تکلیف میں لگ رہا تھا۔ زمر یک ٹک اس کی زخمی نظروں کو دیکھ گئی۔

”یہ معاملات لمبے چلتے ہیں سعدی۔ کوئی بات نہیں، ہم لڑتے رہیں گے۔“

”مجھے نہیں پتہ۔“ وہ سر جھٹک کر خفا خفا سا چلتا گیا۔ زمر کے اندر کچھ ڈوب گیا تھا۔ وہ بار بار اس پر ایک فکر مند متحیر نظر ڈالتی تھی۔

حسین اور اسامہ کا بھائی گھر آ گیا تھا، یو طے تھا، مگر کیا سعدی یوسف گھر آ گیا تھا؟ وہ کیا کرے؟ اور کیا وہ کبھی گھر آ پائے گا؟ اسے یقین نہیں رہا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

ایک تو خواب لیے پھرتے ہو گلیوں گلیوں

اس پر تکرار بھی کرتے ہو خریدار کے ساتھ

ہارون عبید کی رہائش گاہ پہ وہ دوپہر سردی تپش لئے سارے کو جھلسا رہی تھی۔ سبزہ زار کی طرف کھلتی کھڑکی سے اندر جھانکنا تو اپنے کلینک میں آبدار مخصوص کرسی پہ بیٹھی نوٹ پیڈ پہ کچھ لکھ رہی تھی۔ کھڑکی کی طرف اس کی کرسی کی پشت تھی اور یہاں سے اس کا نیم رخ دکھائی دیتا تھا۔ سرخ رومال میں بندھے بال، جھکی آنکھیں، زرد رنگت، سوکھے ہونٹ۔ وہ اداسی سے سر جھکائے لکھتی جا رہی تھی جب دروازہ کھلا۔

”میں آج مزید کلائنٹس نہیں....“ اکتا کر بولتے اس نے نظریں اٹھائیں تو رک گئی۔ یہاں سے دکھائی دیتے آدھے چہرے پہ واضح

حیرانی ابھری۔

”بابا! خیریت؟“ سامنے چوکھٹ میں ہارون کھڑے تھے۔ کلف لگے شلوار سوٹ میں ملبوس، وہ مطمئن نظریں اس پہ جمائے، ہلکی سی

مسکراہٹ کے ساتھ آگے آئے۔ ”تم ٹھیک ہو آبی؟“

آبی نے کرسی پہ پیچھے کو ٹیک لگائی تو اب اس کا چہرہ زیادہ واضح ہوا۔ اس پاؤں مسکراہٹ دیکھ گئی تھی۔ ”جی۔ آپ نے وعدہ کیا تھا،

اس لئے اب ٹھیک ہوں۔“

”اؤ کے۔ تمہیں ایک کام کرنا ہے اب۔“ وہ سامنے کرسی پر براجمان ہوتے ساوگی سے بولے تھے۔ آبدار کے ابرو اکٹھے ہوئے۔ ”جی؟“

”ہاشم نے نوشیرواں کی ضمانت کروالی ہے۔ اب وہ ٹرائل کولنگائے گا، تاریخ پہ تاریخ لیتا جائے گا۔ یوں فیصلہ نہیں آئے گا۔ تم نے صرف اس کو کنوینس کرنا ہے کہ وہ اس کیس کو جلد انجام تک پہنچانے پر رضامند ہو جائے۔“

”مگر بابا! اس نے مجھے پر پوز کیا تھا میں اس دن سے اس کی کالز نہیں اٹھا رہی ہوں تاکہ وہ مجھ پہ دباؤ نہ ڈالے۔ اب میں کیس اس کے پاس جا کر....“

”یہ میرا مسئلہ نہیں ہے۔ تم اس کو کچھ بھی کہو۔ مگر اس کو راضی کرو۔ تم چاہو تو کہہ دینا کہ اس پر پوزل پہ تم صرف تب غور کرو گی جب وہ اور اس کا خاندان تمام الزامات سے بری ہو جائے گا۔“

”بابا! اس نے بے یقینی سے انہیں دیکھا۔“ میں اس پر پوزل پہ غور نہیں کروں گی۔ پھر میں اسے جھوٹی امید کیوں دلاؤں؟“

”بعد میں جو ہوگا ہو میں سنبھال لوں گا۔ ابھی کے لئے تمہیں اس کو راضی کرنا ہے۔“ وہ زور دے کر بولے۔ آبدار کے لب بھنج گئے۔ وہ کتنی ہی دیر صد ماتی نظروں سے انہیں دیکھے گئے۔

”اؤہ میں سمجھی تھی کہ بالآخر آپ میرا خیال کرنے لگ گئے ہیں، مگر وہ سب.... وہ وعدہ وہ قارس کے متعلق کئی ہر بات.... وہ سب آپ اپنے مفاد میں کر رہے تھے۔ آپ مجھے استعمال کر رہے تھے اور قارس کو بھی استعمال کرنا چاہتے ہیں۔ آپ صرف اسے میرا پاؤں گاڑ دینا چاہتے ہیں۔ ہے نا؟“

”آبدار!“ وہ قمیض جھاڑتے اٹھ کھڑے ہوئے۔ چہرے پہ سنجیدگی تھی۔ ”ہاشم سے تمہاری جان صرف تب چھوٹے گی جب وہ اپنے خاندان سمیت نیست و نابود ہوگا۔ اسکے لئے تمہیں وہ سب کرنا ہوگا جو میں کہوں گا۔ اب فیصلہ تمہارا ہے۔“

”آپ کو اندازہ ہے کہ ہاشم کے ساتھ اتنا خطرناک کھیل شروع کر کے آپ مجھے کتنے بڑے خطرے میں ڈال رہے ہیں؟“ اس کی آنکھیں بھیگ گئی تھیں۔

”اپنی خواہشات کی تکمیل کے لئے انسان کو قربانیاں دینا پڑتی ہیں۔ تمہیں بھی دینی ہوگی۔ جیسے زمر صاحبہ دیں گی۔“ آخری الفاظ زبر لب کہے تھے اور پھر وہ مڑے اور لمبے لمبے ڈگ بھرتے باہر نکل گئے۔ آبدار کی آنکھوں سے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

ہم کو اس عہد میں تعمیر کا سودا ہے جہاں
لوگ معمار کو جن دیتے ہیں دیوار کے ساتھ

وہ ایک پوش علاقے کی خوبصورت صاف ستھری کالونی تھی۔ قطار در قطار بنے اونچے بنگلے جدید ترین و آرائش کا نمونہ پیش کرتے نظر

آتے تھے۔ رات تاریک ہو چکی تھی۔ آسمان پہ تارے جگمگا رہے تھے۔ ایسے میں ایک لمبی سی لش چمکتی بی ایم ڈیو ایک کھلے گیٹ میں داخل ہو رہی تھی۔ پورچ میں آکر وہ رکی ڈرائیونگ ڈور کھلا اور سفاری سوٹ میں ملبوس منظور جیلانی باہر آتا دکھائی دیا۔ ہاتھ کے اشارے سے اس نے وہاں کھڑے گارڈز کو واپس جانے کا کہا اور تیز تیز چلتا لان چیئرز کی طرف آیا جہاں کوئی اس کا انتظار کر رہا تھا۔

”میں معذرت چاہتا ہوں غازی صاحب مجھے دیر ہو گئی اور آپ کو انتظار کی زحمت سے گزرنا پڑا۔“ خوش خلقی سے مصافحے کے لئے ہاتھ بڑھایا تو وہاں کھڑے فارس نے مسکرا کر گرم جوشی سے ہاتھ تھاما۔ جیلانی نے ایک نظر میز پر رکھے دو بریف کیسز کو دیکھا اور پھر کرسی کھینچ کر بیٹھا۔ فارس بھی اپنی کرسی پہ واپس بیٹھا۔ وہ سردی میں کمی کے باعث جنیز کے اوپر سیاہی شرٹ پہنے ہوئے تھا۔ چہرے پہ ہلکی مسکراہٹ تھی اور سنہری گہری آنکھیں جیلانی پہ جمی تھیں۔

”میں معذرت کرنا چاہتا تھا۔ میرا بھانجا بہت جلد باز اور جذباتی ہے۔ ان معاملات کے رموز نہیں سمجھتا۔“ کان کی لومستے ہوئے اس نے معذرت خواہانہ انداز میں بات شروع کی۔ منظور جیلانی نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں ہاتھ جھلایا۔

”ہم سب اس عمر میں ایسے تھے۔ مگر جب انسان کی عمر بڑھتی ہے تو ترجیحات اور کام کرنے کے طریقے بدل جاتے ہیں خیر آپ مطلوبہ رقم لے آئے۔“

”میں لے آیا ہوں مگر چاہتا ہوں کہ آپ سعدی یوسف کو یہ بات نہ بتائیں۔ اس کو یوں کال کریں گویا ہم یہاں ملے ہی نہیں تھے اور اس سے معذرت کر کے تھوڑا بہلا کر اسے انٹرویو کے لئے بلا لیں۔ اس کو اعتماد دیں کہ یہ انٹرویو صرف اس کی سچائی کو دنیا کے سامنے لانے کے لئے کیا جا رہا ہے۔“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ کوئی چائے پانی دیا یا نہیں آپ کو۔“ وہ فون نکالتے ہوئے بولا تو فارس نے اسی طرح ٹیک لگائے بیٹھے ہاتھ اٹھا کر منع کیا۔

”آپ ان کو گن لیں اور انٹرویو نام کثرم کر دیں تو میں گھر جاتا ہوں۔“

”چلیں ٹھیک ہے۔ کوئی کمی بیشی ہوئی تو میرا پی اے صبح آپ کو فون کر کے....“ بریف کیس کھولتے ہوئے اصرار کرتے ہوئے ہاتھ اٹھا اور پھر یکایک اس کے الفاظ لبوں پہ ٹوٹ گئے۔ ہاتھ ٹھہر گئے۔ اس نے ڈھکن پورا کھولا اور پھر چونک کر فارس کو دیکھا۔

وہ اسی طرح ناگ پناگ جمائے بیٹھا مسکرا رہا تھا۔

”یہ کیا ہے؟ اور پیسے کہاں ہیں؟“ اصرار کرنے ڈھکن میز تک الٹ دیا تو بریف کیس کا اندرونی حصہ روشنی میں واضح ہوا۔ اس میں کئی درجن سی ڈیز رکھی تھیں جو سفید پلاسٹک کور میں مقید تھیں۔

”پیسے تو خیر میرا باپ بھی نہیں دے گا۔ اور گارڈ کو بلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں سعدی یوسف نہیں ہوں۔ دو دفعہ قتل کے جرم میں جیل جا چکا ہوں بغیر آواز نکالے بندہ مارنا مشکل نہیں ہے میرے لئے۔ نہیں نہیں تمہیں نہیں مارنا میں نے۔ ورنہ پھر سعدی کا انٹرویو کون

کرے گا؟“

اسکر نے بریف کیس ہاتھ مار کر نیچے گر لیا اور غصے سے اس کو دیکھا۔ ”یہ دھمکیاں مجھ جیسے آدمی کو نہیں ڈراتیں۔ اگر میرا مزید وقت ضائع نہیں کرنا تو تم جاسکتے ہو۔“ اور ساتھ ہی وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ نتھنے پھلائے وہ غصے سے فارس کو دیکھ رہا تھا۔

”جیلانی صاحب!“ فارس بھی پورے قد سے اٹھا اور چیز کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے اس کو بہت سکون سے دیکھا۔ ”اگر میں تمہاری جگہ ہوتا تو ایسے نہ کرتا۔ ذرا تحمل سے ٹھہر کر پوچھتا ضرور کہ ان سی ڈیز میں کیا ہے۔ اور جانتے ہو ان میں کیا ہے؟“

کہنے کے ساتھ اس نے جیب سے ایک پین نکال کر میز پر رکھا۔ سعدی کا پین کیمرہ۔

”مجھے معلوم تھا تم سعدی کو پیسے مانگتے بلا رہے ہو تو میں نے سوچا ان لحاظ کو ضائع نہیں کرنا چاہیے۔ سو تمہاری اور سعدی کی گفتگو کی

ویڈیو HD کوالٹی میں محفوظ کر لی میں نے۔ صرف یہی نہیں تمہارے آفس میں جو تمہاری وال فوٹو لگی ہے وہی جس میں امریکہ میں تم کوئی ایوارڈ لیتے دکھائی دے رہے ہو اس کے اوپر تھا وال اسکرچ کا ہے جو تمہارے آفس کی live فیڈ مجھے دیتا ہے۔ اس بریف کیس میں بہت سے لوگوں کے ساتھ تم گفتگو کرتے دکھائی دے رہے ہو۔ کسی کے ساتھ فون پہ کسی کے ساتھ آمنے سامنے۔ تمہاری کلین سویپ ٹیم جو ہر جمعرات کو تمہارا آفس ڈی بک کرتی ہے ان کے آلات بہت پرانے ہیں وہ میرے وال اسکرچز کو نہیں پکڑ سکتے۔“

منظور جیلانی کے چہرے کا سارا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ پہلے وہ چونکا تھا پھر تمحیر ہوا پھر بے یقین اور آخر میں... اس کی رنگت سفید پڑنے لگی تھی۔

”یہ مختلف قابل ذکر واقعات کی سی ڈیز ہیں جن میں تم صاف دکھائی دیتے ہو۔ اب میرے پاس دو راستے ہیں پہلا میں تمہیں یہ سب

دے دوں۔ اور تم سعدی یوسف کے اوپر ہفتے کے پانچ دن پانچ شوز کرو۔ نتیجہ سعدی کی کہانی پورا ملک سن لے گا۔“ وہ جیبوں میں ہاتھ ڈالے کھڑا اس کی آنکھوں پر اپنی آنکھیں جمائے چبا چبا کر کہہ رہا تھا۔ ”دوسرا راستہ یہ ہے کہ میں تمہارے مخالف چینل کو یہ tapes دے

دوں۔ سب سے زیادہ اہم ٹیپ سعدی یوسف کی ہے اس ملاقات میں سعدی نے اپنے اوپر ہونے والی زیادتیوں کی مختصر تفصیل بتائی تھی

تمہیں۔ دوسری اہم ٹیپ امریکہ میں قید پاکستانی نیروں میں جن لڑکی کی بہن کی ہے جس سے تم فون پہ پچاس لاکھ مانگ رہے ہو اور نہ اس کی

بہن کی رہائی کے لئے شو نہیں کرو گے۔ جب یہ ویڈیوز بار بار میڈیا پہ چلائی جائیں گی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ سعدی یوسف کی کہانی پوری دنیا جان

لے گی۔ بنا پیسوں کے گھنٹوں کا انٹیرنٹ ملے گا اس کو۔ چاہوں تو میں یہ کر لوں مگر تمہارے گھر والوں نے چائے پلائی ہے مجھے اب مجھے اچھا

نہیں لگد ہا کہ تمہارا دل توڑوں اسلئے....“ وہ ایک دم آگے بڑھا اور جیلانی کو گریبان سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا اور بدلے ہوئے لہجے میں

غرایا۔ ”تم کل صبح سعدی کو فون کرو گے اس کو عزت سے بلاؤ گے اس سے معافی مانگو گے اور اس کا شواتا اچھے سے کرو گے کہ تمہارے ٹویٹر

کے تیس لاکھ فالووز کو اس کا نام اور اس کی کہانی ازبر ہو جائے۔ ورنہ میں.... تمہاری.... زندگی.... برباد کر دوں گا“ کیونکہ تم جیسے لوگوں کے لئے

.... منج.... جیوری.... اور جلاؤ میں ہی ہوں!“ جھٹکے سے اس کا گریبان چھوڑا۔ وہ بالکل ہکا بکا اور شل سا تھا۔ فارس نے کیمرہ پین اٹھایا اور

جانے کے لئے آگے بڑھ گیا۔ دو قدم اٹھائے پھر مڑا اور پوری قوت سے اس کے جڑے پہ مکار سید کیا۔ جیلانی لڑکھڑا کر پیچھے کو گرنے لگا مگر کرسی کو تھام لیا۔ اس کا ہاتھ اپنے منہ پہ تھا جس سے خون بھل بھل بننے لگا تھا۔ تھلانا ہوا چہرہ اٹھا کر اس نے دبے دبے غصے سے فارس کو دیکھا مگر بولا کچھ نہیں۔

فارس اپنی مٹھی کو چہرے کے قریب لے کر گیا اس میں پھونکا اور پھر کار جھٹکتے جانے کے لئے مڑ گیا۔
اسٹکر اپنا زخمی چہرہ لئے دہرا ہوئے کھڑا اس کھلے بریف کیس کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

دل کے دریا کو کسی روز اتر جانا ہے

اتنا بے سمت نہ چل لوٹ کے گھر جانا ہے

اس تاریک دات زمر اپنے کمرے میں اکیلی بیٹھی تھی۔ اسٹڈی ٹیبل پہ لیپ ٹاپ کھلا رکھا تھا اور ساتھ میں سیاہ مٹلیس ڈبی بھی کھلی پڑی تھی۔ وہ گفتگیاں لے ہال جوڑے میں لیٹے کہنیاں میز پر رکھے، تھیلیوں میں چہرہ گرائے یا سیت سے ہیرے کی لوگ کو دیکھ رہی تھی۔ چناؤ اس کے سامنے تھا مگر فیصلہ نہیں ہو پا رہا تھا۔

اس نے پھر سر جھٹکا اور لیپ ٹاپ اسکرین کی طرف متوجہ ہوئی۔ آن لائن ترجمہ کھلا رکھا تھا سامنے۔ آج دل اتنا بکھرا بکھرا بے کیف تھا کہ وہ کچھ لکھ ہی نہیں پا رہی تھی۔ پھر اس نے توجہ اور دھیان کو اسکرین کی جانب مجتمع کرنا چاہا۔

”میں اللہ کی پناہ چاہتی ہوں شیطان مردود سے،“

اللہ کے نام کے ساتھ جو بہت مہربان، بار بار رحم کرنے والا ہے۔“

”بھلا کون ہے جو تمہیں جنگل اور دریا کے اندھیروں میں راستہ بتاتا ہے اور اپنی رحمت سے پہلے کون خوشخبری کی ہوائیں چلاتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور معبود ہے اللہ ان کے شرک کرنے سے بہت بلند ہے۔“

بھلا کون ہے جو اس سر نو خلقت کو پیدا کرتا ہے پھر اسے دوبارہ بنائے گا اور کون ہے وہ جو تمہیں آسمان اور زمین سے دُوری دیتا ہے کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی معبود ہے کہہ دے اپنی دلیل لاؤ اگر تم سچے ہو۔“

کہہ دے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی بھی غیب کی بات نہیں جانتا اور انہیں اس کی بھی خبر نہیں کہ کب اٹھائے جائیں گے۔“
زمر نے کی بورڈ پر کھاپنے زرد ہاتھ دیکھے پھر جھکے چہرے کے ساتھ ٹاپ کرنے لگی۔ ”اس دنیا میں انسان.... ہم انسان بہت سے کاموں کے لئے بہت سے لوگوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ نوکری کے لئے.... پڑھائی کے لئے.... کورٹ میں کیس چلانے اور انصاف لینے کے لئے....“ تلخی سے سر جھٹکا۔ ”ہم انسان ”آزاد“ نہیں ہیں۔“

”آزادی صرف ایک myth ہے۔ نہ مرد آزاد ہیں نہ عورتیں۔ سب مجبوریوں سے بندھے دوسروں پہ انحصار کرتے ہیں۔ مگر اللہ تعالیٰ

فرماتے ہیں کہ ہمیں اندھے اندھیروں میں جب سمجھ نہیں آ رہا ہوتا کہ کیا کریں، کیا فیصلہ لیں، کون سا راستہ اپنائیں، تب ہمیں راستہ دکھانے والا صرف اللہ ہوتا ہے۔ اور کون ہوتا ہے؟ کوئی بھی نہیں۔ یہ جو لوگوں کی خوفناک آوازیں اور باتیں ہمیں ڈراتی ہیں، ہمیں مستقبل کا خوف دلاتی ہیں، اندھی طوفان جیسی آوازیں اور ہم کان لپیٹ لیتے ہیں، یہ حسرت کی بارش سے پہلے کی ہوائیں ہوتی ہیں۔ یہ بھی اللہ بھیجتا ہے۔ اچھے دنوں کے آغاز سے پہلے شدید بری باتیں سنی پڑتی ہیں، بس ہمارے ضبط کا امتحان ہوتا ہے۔ لوگ نہیں لے رہے، یہ امتحان بھی اللہ لے رہا ہے۔ مگر کیا ہمیں اس پر اتنا بھروسہ ہے کہ صرف اسی پہ انحصار کر سکیں؟ اور اگر ہم نہیں کرتے صرف اسی پر توکل تو اس کو فرق نہیں پڑتا۔ اللہ تعالیٰ لوگوں کے موازنوں اور مقابلوں سے بہت اوپر بہت بلند ہے۔ وہ پھر بھی انسانوں کو پیدا کرتا رہے گا، ان کو مارنے کے بعد دوبارہ بھی اٹھائے گا۔ ان کو دوزی بھی دے گا۔ ہماری قسمتوں میں کیا لکھا ہے، ہماری شادیاں کب تک چلیں گی، بچے کیسے ہوں گے، بڑے ہو کر کیا ہوگا ان کا، ہمیں موت کس زمین پہ آئے گی، یہ سب ہمیں نہیں پتہ۔ اسے پتہ ہے۔ پھر بھی ہم لوگ اتنے کمزور ہیں کہ صرف اس پہ بھروسہ نہیں کرتے۔ انسانوں کو سہارا بناتے ہیں۔ انسانوں کو سبب بنانا چاہیے، مدد دینی چاہیے، مگر سہارا نہیں بنانا چاہیے۔ ان کے دیے گئے چناؤ کے آپشنز کے آگے ہاتھ باندھ کر مجبور نہیں ہو جانا چاہیے۔ ایک آنسو آنکھ سے ٹوٹا اور گال پہ لڑھکتا گیا۔ وہ جھکے چہرے کے ساتھ ٹانپ کرتی جا رہی تھی۔ ”مگر ہم یہ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ۔ ابھی ایمان اتنا مضبوط نہیں ہوا ہمارا کہ سر پہ کفن باندھ کر نکلیں اور صرف آپ کی مدد کا یقین رکھیں۔ کچھ غلط قدم اٹھانے پڑتے ہیں، ہم بہت کمزور ہیں۔“

”بلکہ آخرت کے معاملے میں تو ان کی سمجھ گئی گزری ہے۔ بلکہ وہ اس سے شک میں ہیں بلکہ وہ اس سے اندھے ہی ہیں۔“

”ہم کیوں خود کو ان لوگوں کا محتاج کر لیتے ہیں جن کو آخرت کا کوئی خوف نہیں ہے۔ انسان کے دل سے آخرت کا خوف نکل جائے، کیسے پتہ چلتا ہے اس کا؟“ اس نے رک کر سوچا۔ آنسو سوکھ چکا تھا مگر نشان گال پہ ہنوز موجود تھا۔ ”پہلے انسان کی سمجھ بوجھ ختم ہوتی ہے۔ پھر وہ اللہ کی باتیں سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہے۔ وہ دل پہ بوجھ اور دماغ کے لئے کوفت بننے لگتی ہیں۔ پھر شک پیدا ہوتا ہے۔ دل کا آئینہ آلود ہو جاتا ہے۔ اور جب انسان دوسروں کا علاج نہیں کرتا، ان کو جھٹکتا نہیں ہے، اور ان کے مدلل جواب تلاش نہیں کرتا کہ صرف جھٹکنا کافی نہیں ہوتا۔ تو وہ اس شک کا پیچھا کرنے لگ جاتا ہے۔ شک اسے دور اندھیروں میں بھٹکا دیتا ہے، اور وہ اندھا ہو کر بھٹکتا چلا جاتا ہے، بہتا چلا جاتا ہے، اور پھر....“ اس نے پچھلی آیت دیکھی، گویا الٹا چکر کاٹا ہو۔ ”اور پھر کون ہے جو انسان کو اندھیروں سے نکال سکتا ہے، راستہ بتا سکتا ہے سوائے اللہ کے؟ اوہ اللہ، میں کیا کروں؟“

اس نے بازو بچھا کر ان پہ سر رکھ لیا اور آنکھیں بہت کرب سے بند کر لیں۔ سعدی.... یا قارس.... بار بار دو نام ذہن میں ابھرتے تھے۔ چناؤ مشکل تھا۔ ناممکن تھا.... دروازہ کھلنے کی آواز آئی تو وہ سیدھی ہوئی اور بنجیدگی سے کان کے پیچھے بال اڑتی کی بورڈ پہ انگلیاں چلانے لگی۔ اپنا لکھا گروپ پہ پوسٹ کیا اور دوسری ونڈ دکھول لی۔ نکلیوں سے وہ دیکھ سکتی تھی کہ فارس کمرے میں داخل ہوا تھا۔ آستین کے کف موڑتا وہ مدھم مسکراہٹ کے ساتھ اس کی طرف چلا آیا۔

”اب خوش ہیں آپ؟ ہو گیا ہیر و کا انٹرویو؟“ وہ اس کے کندھوں پہ جھک کر اس کے کان کے قریب کہہ رہا تھا۔ وہ اس وقت بے زار تھی، بہت بے زار۔ سنجیدگی سے ماتھے پہ ہل لئے ٹائپ کرتی رہی۔ بس ”ہوں“ کہا۔

”تو پھر کیا کھلائیں گی آپ مجھے؟ ایک بہت اچھا آئس کریم پارلر ہے....“ وہ پیچھے سے جھک کر کھڑا اس کی کرسی کے دائیں بائیں ہاتھ رکھے کہہ رہا تھا۔

”جو اس وقت تک کھلا ہوتا ہے۔ آپ کی فیورٹ آئس کریم ملتی ہے وہاں سے۔ چلیں گی۔“

”میں.... کام کر رہی ہوں فارس!“ وہ اسکرین پہ نگاہیں جمائے سنجیدگی سے بولی تھی۔ گویا اسے نظر انداز کیے رکھا۔ مگر اس نے جیسے سنا ہی نہیں تھا۔

”اور اگر آپ چاہیں تو ہم اس کے قریب ایک دوسرے اچھے ریستورانٹ میں بھی جاسکتے ہیں جہاں پر....“ اس کے بالوں پہ تھوڑی رکھے وہ اپنی دھن میں کہہ رہا تھا جب ذمہ نے جھٹکے سے اسکرین نیچے گرائی اور کھوی۔ ”ہم ریستورانٹس اور کافی شاپس نہیں جاسکتے فارس۔ کیا تمہیں احساس ہے کہ سعدی کو کیا ہو گیا ہے؟ وہ بیمار ہو چکا ہے وہ مسخ ہو چکا ہے۔ ہم عدالت میں ایک آئی پی پی کے خلاف کیس لڑنے جا رہے ہیں۔ ہمیں کیس کی تیاری کرنی ہے۔ آئس کریم اور کھانوں کے لئے وقت ہے ہمارے پاس؟“ غصہ کسی اور کا تھا، کلا کسی اور پہ تھا۔ دل کسی اور نے توڑا تھا۔ چھپا کسی اور سے لیا تھا۔ وہ سرخ چہرے اور جذبات سے کانپتی آواز سے بولی تھی۔

فارس کی مسکراہٹ غائب ہوئی۔ کرسی سے ہاتھ ہٹا کر تیزی سے سیدھا ہوا۔ ایک خاموش مگر ہم نظر اس پہ ڈالی پھر سرعت سے میز پہ رکھی چابیاں اٹھا تا باہر نکل گیا۔ دروازہ ٹھا سے بند کیا۔

وہ کرسی پہ اکیلی بیٹھی رہ گئی۔ زور سے بند ہوئے دروازے کی کپکپاتی آواز سنتی رہی۔ چند لمحے گہرے سانس لیتی رہی۔ اس کی آنکھوں میں پانی تھا۔ اور چہرہ جھکا ہوا تھا۔ یکدم اس نے چہرہ اٹھایا۔

جو فیصلہ اتنے دن سے ہو نہیں پار رہا تھا وہ اس لمحے اس گھڑی ہو گیا تھا۔ چناؤ ہو گیا تھا۔ وہ تیزی سے اٹھی اور ننگے پاؤں باہر کو بھاگی۔ وہ پورچ میں کھڑا خنگلی سے بڑبڑاتا کار کالاک کھول رہا تھا۔ اس کے کان سرخ تھے اور ماتھے پہ سلوٹیں پڑی تھیں جب وہ دوڑتی ہوئی بیرونی دروازے کی چوکھٹ تک آئی۔

”آئی ایم سوری۔“ فارس نے ایک پاٹ نظر اٹھا کر دیکھا اور پھر سر جھکا کر دروازہ کھولنے لگا۔ وہ دوڑ کر آگے آئی اور کار کا دروازہ پکڑ لیا۔ فارس نے رک کر انہی برہم نظروں سے اسے دیکھا۔ اور پھر وہ چونکا۔ آنسو اس کی آنکھوں سے گر رہے تھے۔ ”آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ میں کام کر رہی تھی.... کر رہی ہوں.... کیس پہ.... کیونکہ وہ کبھی ٹھیک نہیں ہوگا اگر ہم یہ کیس نہ جیتے تو۔ آئی ایم سوری کہ میں نے تمہیں جانے دیا۔ مگر میرے پاس اختیار تھا۔ تمہیں جانے دوں یا کیس پہ کام نہ کروں....“ وہ دروازے کے اوپر دونوں ہاتھ جمائے بہتے آنسوؤں کے ساتھ کہہ رہی تھی۔ فارس کے ماتھے کی سلوٹیں ویسی ہی تھیں البتہ اثرات کی سختی کم تھی۔

”میرے پاس چوائس تھی۔ تم یا سعدی۔ میں فیصلہ نہیں کر پا رہی تھی۔“ تاروں جیسے آنسو ٹوٹ ٹوٹ کر اس کی گردن پر لڑھک رہے تھے۔ موٹی خوبصورت ٹھنکریا لیٹوں کے ہالے میں اس کا زرد چہرہ بہت دکھی لگتا تھا۔ فارس کی پیشانی کی شکنیں کم ہوتی گئیں۔

”میں تمہیں نہیں جانے دے سکتی تھی۔ میں سعدی کو بھی واپس لانا چاہتی تھی۔ میں ایک وقت میں ایک کا چناؤ کر سکتی تھی۔“ فارس نے ترجمہ سے دیکھا۔

”زمر تم لوگ خواہ مخواہ اتنا خوار کر رہے ہو خود کو۔ ٹرائل کبھی نہیں چلے گا۔ ایک سال سے پہلے تو شروع نہیں ہوگا۔ ہاشم کبھی کیس نہیں چلے دے گا۔“ مگر وہ نہیں سن رہی تھی۔

”میرے پاس چناؤ کا اختیار تھا۔ مگر فارس... میں تمہیں نہیں چنوں گی۔“ وہ نفی میں سر ہلا کر کہہ رہی تھی۔ اس کی بھگی آنکھیں زخمی تھیں۔

”کیونکہ تم میرے ہو۔ جو میرا ہے وہ میرا ہے گا۔ میں تمہیں نہیں چنوں گی کیونکہ کوئی بھی تمہیں مجھ سے دور نہیں کر سکتا۔“

اس کے چہرے کی آخری شکن بھی جاتی رہی۔ گہری سانس لے کر وہ اسے دیکھ گیا۔ ”تو کون تمہیں مجھ سے دور کر رہا ہے سوائے تمہارے اپنے؟“

”اور میں سعدی کو بھی نہیں چن رہی۔“ وہ اسی طرح روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں کیوں چنوں اس کو؟ میں مجبور نہیں ہوں۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے نہیں ہیں۔ میں کسی انسان کے سامنے مجبور نہیں ہوں۔ انسان اندھیروں میں راستہ نہیں دکھا سکتے۔ میں نے اپنا چناؤ کر لیا ہے۔“ ہتھیلیوں کی پشت سے گال رگڑتے ہوئے اس نے چند گہرے سانس لے کر خود کو سنبھالنا چاہا۔ آنسو پھر بھی ابل ابل رہے تھے اور ناک اور گال گلابی پڑ رہے تھے۔

”میں فارس کو نہیں چنوں گی۔ میں سعدی کو نہیں چنوں گی۔ میں... زمر کو چنوں گی۔ میں خود کو چنوں گی۔“ اٹھی گردن اور مضبوط آواز سے وہ چہرہ صاف کرتے ہوئے بولی تھی۔ ”میں وہ کروں گی جو زمر کو کرنا چاہیے۔ ظلم زمر کے ساتھ بھی ہوا ہے۔ سب اپنی زندگی شروع کر سکتے ہیں سوائے میرے۔ زمر کا انصاف چاہیے۔ یہ صرف سعدی کے لئے نہیں ہے۔ یہ زمر کے لئے بھی ہے۔ مجھے بھی تک سکون نہیں ملے گا جب تک میں ان لوگوں کو تباہ ہوتے نہ دیکھ لوں۔ میں... زمر کو چن رہی ہوں۔ اور زمر بہت اچھی اداکارہ ہے۔“

اب کے وہ آنکھیں سکیڑ کر غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔ ”زمر اگر کوئی بات ہے تو تم مجھے بتاؤ۔ ایک دفعہ پہلے بھی تم روتے ہوئے کمرے میں آئی تھیں، تمہیں دے کا انیک ہوا تھا اور تم درختوں کی باتیں کر رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھا اور نرمی سے اس کے ہاتھ تھام لئے۔ ”بعد میں عدالت میں تم نے بتایا مجھے کہ اس رات تم نے حقیقت جان لی تھی۔ میں اب نہیں سمجھ پا رہا کہ کیا ہوا ہے مگر کچھ ہوا ضرور ہے۔ مجھے بتاؤ۔“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔ وہ بھیکے چہرے کے ساتھ مسکرا دی اور نفی میں سر ہلا دیا۔

”میرا ڈپریشن میرا ذہنی دباؤ بہت بڑھ گیا تھا۔ مجھے لگتا تھا میں کیس کی وجہ سے تم سے دور ہو جاؤں گی۔ مگر نہیں...“ اب کے وہ دھلے دھلائے چہرے اور گلابی آنکھوں کے ساتھ مسکرا کر بولی تھی۔ ”جو میرا ہے وہ میرا ہے گا۔ مجھے تمہیں نظر انداز یا ناراض کرنے کی ضرورت

نہیں ہے۔ ہم اچھی امید اور اچھی تیاری کے ساتھ بھی یہ کیس لڑ سکتے ہیں۔ اور... تم جب کہو گے ہم ڈنر پہ بھی جاسکتے ہیں۔“
وہ ہلکا سا مسکرایا۔ تنے اعصاب ڈھیلے پڑے۔ وہ جو لمحے بھر کے لئے وہ ڈر گیا تھا کہ کچھ ہوا ہے وہ واہمہ بھی ذہن سے جاتا رہا۔ اس نے
نری سے اپنے قریب کیا اور اس کا سر اپنے کندھے سے لگا کر چند لمحے تھپکتا رہا۔ اور پھر بہت محبت سے دھیرے سے بولا۔
”آئی ہیٹ یو چڑیل!“

وہ ایک جھٹکے سے الگ ہوئی۔ بھٹکی گلابی آنکھوں میں ایک دم ڈھیر سا راضہ عود آیا تھا۔ ”کیا کہا؟“ وہ بے یقین بھی تھی۔
”اگر شفیع نے تمہارا نام چڑیل رکھا تھا۔ قوی اطلاع ہے کہ پکھری میں بہت سے لوگ تمہیں اسی نام سے پکارتے ہیں اور میں ہر نماز میں
دعا کرتا ہوں کہ اللہ ان لوگوں کو نیک اجر عطا کرے۔“ وہ کار کا دروازہ کھولتا کہہ رہا تھا اور زمر نے بہت مشکل سے اپنی ہنسی روکی چہرے پہ
نظمی طاری کیے وہ جھج کر بولی تھی۔

”مگر تمہیں مجھ سے ذرا سی محبت ہوتی تو تم میرے بارے میں ایسی باتیں کرنے والوں کے دانت توڑ دیتے۔“
”آپ کو کس نے کہا کہ مجھے آپ سے محبت ہے؟ میں نے تو آپ کی دولت کے لئے آپ سے شادی کی تھی۔“
”دولت سے یاد آیا میرے پیسے کہاں ہیں؟ ہاں؟“ وہ اندر بیٹھ چکا تھا اور وہ اس کی کھڑکی پہ جھکی ناراضی سے کہہ رہی تھی۔
”جن پیسوں کو ہاشم کا ردارٹریس نہیں کر سکا، آپ نے سوچا بھی کیسے کہ وہ آپ کو مل جائیں گے۔ جیسے زمر بی بی جوتے پہن کر آئیں
پھر میں آپ کو ڈنر پہ لے کر جاؤں گا۔“

”ہاں وہ بھی میرے پیسوں سے ہوگا۔“ وہ سیدھی ہوتے ہوئے خفا خفا سی بولی اور مڑ گئی۔ پیچھے سے اس نے اس کی بو بڑا ہٹ سی تھی۔
”لاچی وکیل نہ ہوتی۔“ اس دفعہ اصلی والا غصہ چڑھا مگر سر جھکتی اندر چلی گئی۔ اس کا ٹونا دل بالآخر جڑنے لگا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

خوابوں کے چاند ڈھل گئے تاروں کے دم نکل گئے

پھولوں کے ہاتھ جل گئے، کیسے یہ آفتاب تھے!

وہ صبح پگھلے سونے کی سی حدت لئے ہوئے مطلوع ہوئی تھی۔ سورج کی ترچھی کرنیں قصر کار دار کے ستونوں سے ٹکرا کر پلٹ رہی تھیں۔
اندر اونچی کھڑکیوں سے چھن کر آتی روشنی نے ڈائننگ ہال کو منور کر رکھا تھا۔ سربراہی کرسی پہ ہاشم بیٹھا ناشتہ کر رہا تھا۔ نوشیرواں ہنوز کمرے
میں بند تھا اس کا ساتھ دینے کو دائیں ہاتھ جو اہرات بیٹھی تھی۔ جانے دونوں کی کرسیوں کی جگہ کب بدلی تھی، مگر جو اہرات نے اعتراض نہیں
کیا تھا۔ جانتی تھی کہ اب خاندان کی ڈرائیونگ سیٹ پہ وہ نہیں تھی۔ مگر وہ مطمئن تھی۔ کانٹے میں پھل کا ٹکڑا پھنساتے وہ ہمدردانہ لہجے میں
بولی تھی۔

”تم نے خاوند کے متعلق سنا؟“

”ہوں!“ اس نے سر ہلایا۔ ”اس کے بیٹے کا فون آیا تھا۔ میں مالی طور پر بددکرتا رہوں گا اس کی فیملی کی۔ کچھ عرصے تک۔“

”تمہارا بڑا ظرف ہے، ہاشم!“ اس نے جھرجھری لی۔ وہ خاموشی سے کھاتا رہا تو وہ ذرا پینتیرا بدل کر بولی۔ ”مگر جو بھی ہے، مجھے بہت افسوس ہوا اس کا سن کر۔“

”اپنے کیے کا پھل ملا ہے۔“ اس نے سر جھٹکا تھا، پھر ٹپکین رکھتا اٹھ کھڑا ہوا۔ جواہرات نے گردن اٹھا کر اسے دیکھا۔ وہ آفس کے لئے تیار لگ رہا تھا۔ ٹائی، کف، لفٹس، سب اپنی جگہ پہنچے تھے۔ ”ٹرائل کا کیا بنے گا؟“

”کوئی ٹرائل نہیں چلے گا می۔ ایک ایک پیشی کے لئے ترساؤں گا انہیں۔“ موبائل اسکرین پر انگلی پھیرتے وہ ساتھ سے نکل کر چلا گیا۔ جواہرات نے طمانیت کا گہرا سانس لیا اور مسکرا کر جوس لبوں سے لگا لیا۔ خاور کا باب تو ختم ہوا....

چند میل دور... اس پر شکوہ عمارت کے ایک وسیع آفس میں ہارون عبید اپنی مخصوص کرسی پر براجمان تھے۔ فیک لگا کر بیٹھے، گال تلے انگلی رکھے وہ مخلوط نظروں سے سامنے بیٹھی زمر کو دیکھ رہے تھے جس کی گردن اٹھی ہوئی تھی اور چپچپتی ہوئی نظریں ان پہ جمی تھیں۔ وہ درمیان میں حائل میز کے باعث یہ نہیں دیکھ سکتے تھے کہ زمر نے کرسی کی نشست ایک ہاتھ سے مضبوطی سے تھام رکھی ہے۔ اور ہار ہار وہ تھوک نکل کر خود کو پرسکون ظاہر کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

”تو آپ نے کیا فیصلہ کیا؟“

”اگر آپ واقعی ہاشم کا روادار کو ہمارے ساتھ ٹرائل لڑنے پہ آمادہ کر لیتے ہیں تو ٹھیک ہے۔“ ہلکے سے کندھے اچکا کر خود کو بے نیاز ظاہر کرنا چاہا۔ ”میں فارس کو چھوڑ سکتی ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ذرا سا مسکرائے۔

”اور میں جانتی ہوں کہ آپ یہ اپنی بیٹی کے لئے نہیں کر رہے۔“ اب کہ وہ بھی ذرا سا مسکائی تھی۔ ”آپ فارس کو استعمال کرنا چاہتے ہیں اسے اپنی بیٹی کا باڈی گارڈ بنانا چاہتے ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہو پائے گا۔ وہ کبھی بھی ایسے کسی دام میں نہیں آئے گا۔ میں نہیں وارن کروں گی اسے۔ مگر وہ خود اتنا سمجھدار ہے کہ آپ کا ہر وار خطا جائے گا۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے اس لئے کیوں نا ہم وہ بات کریں جو آپ کا مسئلہ ہے۔“ آگے ہوتے ہتھیلیاں باہم پھنساتے ہوئے انہوں نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ نے اچھا فیصلہ کیا، اپنے بوجھ کو کسی کی زندگی سے نکال کر اسے ہلکا کرنے کا فیصلہ بہت اچھا رہتا ہے۔ آپ کو اور کچھ نہیں کرنا۔ بس اس کی زندگی سے نکل جانا ہے۔“

”مگر ٹرائل کے بعد۔ ہم ٹرائل جیتیں یا ہاریں اس وقت کا انتظار نہیں کروں گی میں، مگر کم از کم جب اتنا کیس چل چکا ہو گا کہ مجھے لگے آپ نے اپنا وعدہ ایفا کر دیا ہے تو میں اسے چھوڑ دوں گی۔“

”اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا تو؟“ کمرے میں لمحے بھر کو سناٹا چھا گیا مگر زمر نے اداکاری جاری رکھتے ہوئے اسی بے نیازی سے شانے

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے پیش کیا ہے

پاک سوسائٹی خاص کیوں ہیں:-

ہائس کو الٹی پی ڈی ایف
ایک کلک سے ڈاؤنلوڈ
ایڈفرس لنکس
ڈاؤنلوڈ اور آن لائن ریڈنگ ایک پیج پر
کتاب کی مختلف سائزوں میں اپلوڈنگ
نازل اور عمران سیریز کی مکمل رینج

Click on <http://paksociety.com> to Visit Us

<http://fb.com/paksociety>

<http://twitter.com/paksociety1>

<https://plus.google.com/112999726194960503629>

پاک سوسائٹی کو فیس بک پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو ٹویٹر پر جوائن کریں

پاک سوسائٹی کو گوگل پلس پر جوائن کریں

ہمیں وزٹ کرنے کے لئے ہمارا ویب ایڈریس براؤزر میں لکھیں یا گوگل میں پاک سوسائٹی تلاش کریں۔

اپنے دوست احباب اور فیملی کو ہماری ویب سائٹ کا بتا کر پاکستان کی آن لائن لائبریری کا ممبر بنائیں۔

اس خوبصورت ویب سائٹ کو چلانے کے لئے ہر ماہ کثیر سرمایہ درکار ہوتا ہے، اگر آپ مالی مدد کرنا چاہتے ہیں تو ہم سے فیس

بک پر رابطہ کریں۔۔۔

ہمیں فیس بک پر لائک کریں اور ہر کتاب اپنی وال پر دیکھنے کے لئے امیج پر دی گئی ہدایات پر عمل کریں:-

**Dont miss a singal one of
your Favourite Paksociety's
Update !**

- i. Open Paksociety Page.
- ii. Click Liked.
- iii. Select Get Notifications.
- iv. Select See First.

All Done

Like Liked Message

☒ Get Notifications
Add to Interest Lists...

Unlike

IN YOUR NEWS FEED

☒ See First
See new posts at the top of News Feed

Default
See posts as usual

Unfollow

اچکائے۔

”جب میں آپ پہ اعتبار کر رہی ہوں تو آپ کو بھی مجھ پہ یقین کرنا چاہیے۔“

”مگر ہو سکتا ہے کہ یہ صرف آپ کی چال ہو۔ آپ صرف وعدہ کرنے کی اداکاری کر رہی ہوں اور اپنا مطلب نکل آنے کے بعد آپ اپنی بات سے پھر جائیں۔ ایسے میں مجھے تو کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔“ ان کی زیرک نگاہیں اندر تک اتر رہی تھیں۔ زمر کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا مگر چہرے پہ مسکراہٹ برقرار رہی۔

”ٹھیک ہے۔ آپ نے یقیناً کوئی کانٹریکٹ بنوا رکھا ہو گا۔ لائیے میں دستخط کر دیتی ہوں۔“

”آپ وکیل لوگ ہر کانٹریکٹ کے ٹکٹے کے سوراخ ڈھونڈ لیتے ہیں، میں ایسی غلطی نہیں کروں گا۔“

”تو پھر آپ میری یہ گفتگو ریکارڈ کر رہے ہوں گے۔ یقیناً تاکہ مجھے بلیک میل کر سکیں۔“

”ایسا بھی نہیں ہے۔“ انہوں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”کیونکہ آپ بہت محتاط الفاظ کا چناؤ کر رہی ہیں اگر اس منظر کی ویڈیو بن کر میں فارس

کو دکھا بھی دوں تو آپ کو ٹم گئیں گی اور میں ولن۔ یوں فیصلہ آپ کے حق میں ہو جائے گا۔ مگر میں ایسا نہیں چاہتا۔“

پہلی بار زمر کو محسوس ہوا کہ کمرے میں تناؤ اور گھٹن بڑھ گئی ہے۔ خطرے کا سائرن دور کہیں زور زور سے بجنے لگا۔ کوئی آواز مگر سنائی نہیں

دیتی تھی، صرف سرخ بتی جلتی جھتی دکھائی دیتی تھی۔ کسی نے اندر کہا کہ اٹھو اور چلی جاؤ، لعنت بھیجو اس کیس پہ، سعدی کو سمجھا لینا، مگر جس کا

اندر زیادہ زور چلتا تھا اس نے اس آواز کو دبایا۔ کیونکہ ”زمر“ کا انتخاب زمر نے کر لیا تھا۔

”تو پھر کیسی ضمانت چاہیے آپ کو مجھ سے؟“

انہوں نے جواب دینے کی بجائے میز پہ کھڑا کر کے سیدھے کھٹے ٹیبلٹ کی طرف توجہ مبذول کی اور اسکرین کو چھو کر کچھ دیکھنے لگے۔

”جب آپ اس عمارت میں داخل ہوئی تھیں تو آپ نے اپنا پرس ایکس رے سے گزرا تھا۔ آپ کے پرس کے اندر کی تصویر... اندر

تک کا خاکہ میرے پاس کھلا رکھا ہے۔ اس میں ایک چھوٹی چوکور شے نظر آرہی ہے جس کے اندر ایک ننھا سا ہیرہ موجود ہے۔ یہ تصویر چونکہ

پرس کا ایک دے ایچ ہے، یہ صرف ایک خاکہ دے سکتا ہے، مگر میں جانتا ہوں کہ وہ ہیرہ اس نوزین کا ہے جو کسی زمانے میں فارس غازی نے

آپ کو دی تھی۔“

کرسی کی نشست پہ جیسے اس کے ہاتھ نے زور سے لیڈر کو بھینچا۔ اس کے کندھے پر سیدھے ہوئے۔ لب پھڑ پھرائے۔ آنکھوں

میں استعجاب ابھرا۔

”اور جب آپ کو یہ معلوم ہوا تھا کہ یہ گفٹ دینے والا فارس تھا تو آپ غصے سے گھر چھوڑ کر جنگل کی طرف نکل گئی تھیں۔ اس دن کے

بعد سے آپ نے اس کو نہیں پہنا۔ حیران مت ہوں۔ کچھ معلومات ہوں نامیرے پاس بھی!“

”یقیناً یہ میرے ملازم نے کاردارز کے گارڈ کو بتایا ہو گا، سب نوکروں کو خبر ہو گئی تھی اس رات۔ اور ملازم کانوں کے جتنے پکے ہوتے ہیں

’زبان کے اتنے ہی کچے ہوتے ہیں۔ خیر، آپ اس نوزین کا ذکر کیوں کر رہے ہیں؟‘
وہ بولی تو آواز میں دہا دہا غصہ سا لگتا تھا۔

’اگر یہ آپ کے پرس میں نہ ہوتی تو مجھے خیال بھی نہ آتا، مگر میری قسمت اچھی تھی۔‘ وہ ٹیلیٹ نیچے رکھتے ہوئے مسکرا کر بولے۔
’آپ اسے خود ہی میرے پاس لے آئیں۔‘ پھر ہاہم مٹھیاں پھنسائے مزید آگے کو ہوئے اور اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ’مسز زمر... اپنی بات پر اعتبار دلانے کے لئے آپ مجھے اس سے اچھی ضمانت نہیں دے سکتیں۔ اس ڈبی کو میرے پاس چھوڑ جائیے۔‘
آسمان کے سارے تارے ایک دم سمندر میں جا گرے تھے۔ اس کا سانس بند کر گیا تھا۔ ’یہ ڈبی؟‘

’جی۔ جب آپ یہ وعدہ پورا کریں گی تو میں اسے واپس کر دوں گا۔ نہیں کریں گی تو میں.... بلکہ میں کیا کروں گا؟ میری ملکیت میں یہ ڈبی دیکھ کر وہ خود ہی آپ کو چھوڑ دے گا۔ اسی کو ضمانت کہتے ہیں نا۔ اسی کو کانسٹرکٹ اور ایگریمنٹ کہتے ہیں نا۔ اور جب آپ نے اسے چھوڑ ہی دینا ہے تو پھر یہ ڈبی کوئی حیثیت تو نہیں رکھتی ہوگی آپ کے لئے۔ سو... اسے... مجھے... دے دیں۔‘
تارے سمندر کی سطح پر چند لمحے تیرتے رہے، مگر تنکے جیسا سہارا بھی نہ ملا تو اندر گرتے چلے گئے... ڈوبتے چلے گئے۔ اس کی بھڑکی آنکھوں کی جوت بجھ گئی۔ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ ہارون منتظر سے اسے دیکھے گئے۔ وہ کچھ نہ بولی۔ چپ چاپ ان کو بھیجی بھجی نظروں سے دیکھتی رہی۔ اس کے ذہن میں پکڑ دھکڑ ہو رہی تھی۔ اور دل بند ہونے کو تھا۔

’میں آپ کے ساتھ کسی قسم کی اداکاری نہیں کر رہی۔ لیکن اگر آپ کو صرف اس طرح یقین آئے تو اس طرح سہی۔‘ پرس سے وہ ڈبی نکال کر اس نے کھول کر میز پر بٹھی۔ اندر جگمگاتا ننھا ہیرا ڈھیر ساری روشنی منعکس کرنے لگا۔
’یہ لیجئے۔ اگر آپ نے اپنا وعدہ پورا نہ کیا تو میں ہاشم کو بتا دوں گی کہ آپ کی بیٹی میرے شوہر کے لئے کیا جذبات رکھتی ہے اور جب اسے پتہ چلے گا تو وہ اس کا کیا حشر کرے گا؟ آپ کو معلوم ہے سواب آپ بھی پیچھے نہیں ہٹیں گے۔‘ وہ سپاٹ لیجے میں کہہ رہی تھی۔
ہارون واقعی چوٹے تھے۔ اس کے الفاظ پر نہیں اس ڈبی کو دیکھ کر۔ پھر انہوں نے ایک سرایتی نظر زمر پر ڈالی۔ ’گویا وہ امتحان میں پاس ہو گئی تھی۔‘

’وہ بہت جلد خود آپ سے کہے گا کہ اسے یہ کیس لڑنا ہے، یہ میرا وعدہ ہے۔ اسی میں ہم سب کا قائدہ ہے۔‘
زمر نے پرس اٹھایا اور ایک کٹیلی نظر ان پر ڈال کر باہر نکل گئی۔ دروازہ زوردار آواز سے بند کیا تھا۔
باہر راہداری میں چلتے ہوئے اس نے بدقت اٹھتے آنسو روکنے چاہے مگر وہ نہیں رکے۔ قطرے ٹپ ٹپ چہرے پر لڑھکنے لگے۔ اس نے رک کر دیوار کا سہارا لیا، گویا خود کو ڈھکے جانے سے روکا ہو، بچایا ہو۔ کچھ کھودیا تھا اور اب دل ڈوب ڈوب کر ابھرتا تھا۔ چند گہرے سانس لیے، چند آنسو پئے اور پھر وہ دوبارہ سے چلنے لگی۔ اب کی دفعہ آنکھوں کی جوت بجھ چکی تھی مگر چال ویسی ہی تھی۔ محتاط سی۔ ذرا سی پھسلن گرا سکتی تھی اور اسے اب کوئی غلطی نہیں کرنی تھی۔

چند میل دور ہاشم کے آفس کے باہر کھڑی آبدار نے موبائل پر آیا پیغام دیکھ کر سے واپس پرس میں ڈالا پھر جی کڑا کر چلتی ہوئی دروازے کے قریب آئی۔ اس کا دل زور زور سے دھڑکا رہا تھا مگر وہ خود کو سنبھالے ہوئے تھی۔ پرسکون رکھنے کی کوشش کیے ہوئے تھی۔

دروازے کا ہینڈل پکڑتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑاتی۔

”اتنا بڑا خطرہ مول لے لوں کیا؟“ پھر سر جھٹکا اور اداسی سے مسکرائی۔

”وہ... تمہارے لئے... ایسا کبھی نہیں کرے گی فارس!“ اور پھر اندر داخل ہو گئی۔ آفس ابھی خالی تھا اور حلیمہ کے بقول ہاشم کے آنے میں آدھا گھنٹہ تھا۔ آبدار کو اب آدھا گھنٹہ ادھر بیٹھ کر اس کا انتظار کرنا تھا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆

”مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔“ حنین یوسف نے اس صبح اس سے یہ کہا تو جواب میں فارس نے سر ہلا کر کہا تھا۔

”مجھے بھی تمہیں کچھ بتانا ہے۔“ وہ دونوں مورچال کے پورچ میں کھڑے تھے اور وہ باہر جانے کی تیاری میں تھا۔

”میں جانتی ہوں آپ کو خاور کے بارے میں بتانا ہے۔ میں بھی وہی بتانا چاہ رہی ہوں۔“ وہ چمکتی آنکھوں اور مغموم مسکراہٹ کے ساتھ بولی تھی۔ ”اس کا ایک بیٹا ہے جو اب واپس اپنی ماں اور دادی سمیت خاور کے گھر آکر رہنے لگ گیا ہے۔ میں نے اس کو سب کچھ بتا دیا ہے۔ اس کے باپ نے کیا کیا اور کن کن کے لئے یہ سب کیا۔ اس کا دل بدل گیا ہے اپنے باپ کے لئے اور کسی شخص کے لئے اس سے بڑی سزا کیا ہوگی کہ اس کی اولاد کا دل بدل جائے اس کے لئے؟ میرا خیال ہے آپ کو....“ وہ جوش سے تیز تیز بول رہی تھی۔

قریباً گھنٹے بھر بعد وہ اس بنگلے کے ڈرائنگ روم میں بیٹھا تھا۔ جنمزا اور شرٹ میں ملبوس وہ ناگ پناگ جمائے سنجیدگی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ عجیب خاموشی کمرے میں حائل تھی۔ سامنے بیٹھا نو عمر لڑکا خاموش تھا۔ وہ الجھا ہوا بھی تھا۔ مگر مقدس خاموشی کو توڑ نہیں پارہا تھا۔

دفعتاً چوکت پڑا ہٹ سی ہوئی۔ وہ دونوں اس طرف دیکھنے لگے۔

ایک عورت پہلے نمودار ہوئی تھی۔ اس کے دونوں ہاتھ ایک وہیل چیئر کی پشت کو تھامے ہوئے تھے جس کو دھکیلتی ہوئی وہ اندر لا رہی تھی۔

فارس کی نظریں وہیں جم گئیں۔ وہ بس اسے دیکھتا رہا۔

وہ خاور تھا۔

اس کا اکڑا ہوا فالج زدہ جسم وہیل چیئر پر رکھا تھا۔ گویا اس میں روح نہ ہو۔ گردن ترچھی منجمدی تھی اور چہرے پر آکسیجن ماسک چڑھا تھا۔ ساتھ چند نالیاں بھی جڑی تھیں۔ اس کے ہونٹ نیڑھے میٹرھے سے ہو کر ایک ذرا پیچھے جم گئے تھے اور آنکھیں.... صرف وہی حرکت کرتی تھیں۔ ان کی سیاہ گیندیں گھوم گھوم کر فارس کے چہرے سے آنکراتی تھیں۔ ان میں بے بسی تھی، خوف تھا، دکھ تھا۔

”کیا ان کی بہتری کی کوئی امید ہے؟“ اس نے سادگی سے لڑکے کو مخاطب کیا۔ لڑکے نے افسوس سے نفی میں سر ہلایا۔

”ان کا جسم مستقل طور پر مفلوج ہو چکا ہے۔ ہاتھ کی صرف ایک انگلی ہلاکتے ہیں ایک دفعہ ہلائیں تو مطلب ہے ہاں، دودفعہ تو ناں۔“

بول بھی نہیں سکتے۔ بس دیکھ سکتے ہیں۔ روتے بہت ہیں۔ آوازوں سے۔ مگر الفاظ نہیں نکلتے۔ ڈاکٹرز کہتے ہیں کہ قدرتی فالج ایک ہے اور ایسی صورت حال میں ہمیں اب سمجھوتہ کرنا پڑے گا۔“ وہ دبی آواز میں بتا رہا تھا۔

فارس بس گردن موڑے اسے دیکھتا رہا۔ جو سنا سنا سا وہیل چیئر پہ پڑا تھا۔ زرو بے جاں چہرہ بے حد گرا ہوا وزن ہڈیوں کا ڈھانچا سا انسان۔ اس کی بھینکی نظریں فارس پہ جمی تھیں۔ بہت سے ماہ و سال دونوں کے درمیان فلم کی طرح چلنے لگے تھے۔

”بول نہیں سکتے تو کیا ہوا۔ سن تو سکتے ہیں نا۔“ وہ بہت دیر بعد بولا تھا اور آواز ٹھنڈی تھی۔ ٹھنڈی اور ساٹ۔

”جی، سن سکتے ہیں۔“ ٹڈ کے نے سر ہلادیا۔

”تو پھر آج کرنل خاور تمہارے ساتھ کچھ سنیں گے۔ ایک کہانی جو میں سنانے جا رہا ہوں۔“ فارس نے نگاہوں کا رخ اس لڑکے کی طرف پھیرا۔ ”اور میں چاہتا ہوں کہ تم اس کہانی کو ساری زندگی یاد رکھو جب تک یہ زندہ ہیں تم روز ان کو وہ کہانی سنایا کرو۔“ خاور کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے تھے۔

”میں سمجھا نہیں۔“ ٹڈ کا اب کے الجھا تھا۔

”جب میں شروع کروں گا تو سمجھ جاؤ گے۔ پھر بتاؤ شروع کروں؟“ اس نے اسی سکون اور اطمینان سے پوچھا تھا۔ لڑکے نے اثبات میں سر ہلایا۔ خاور نے بہت کوشش کی کہ وہ چیخے چلائے گردن ادھر ادھر مارے اس کی منت کرے اسے روکے روئے پیٹے اس کے قدموں میں گر جائے اور اسے منع کرے۔ میرے بیٹے کو مت بتاؤ۔ خدا رامت بتاؤ۔

مگر اب..... اختیار اس کے ہاتھوں سے نکل چکا تھا۔

اور اگر تمہیں کبھی کوئی کہے کہ انسان کے کیے گئے ظلم کھوم پھر کے اس کے پاس ایک دن ضرور لوٹتے ہیں تو یقین کر لینا کیونکہ ایسا ضرور ہوتا ہے۔

ادھر حسین مورچال کے لاؤنج میں بیٹھی ٹی وی دیکھتے ہوئے ڈرائے فروٹ کھا رہی تھی۔ زمر ابھی ابھی لوٹی تھی اور خاموش سی ادھر بیٹھی تھی گویا ذہن کہیں دور الجھا ہو۔ سعدی لیپ ٹاپ لئے بیٹھا کچھ پوائنٹس کاغذ پہ لکھ رہا تھا۔ وہ انٹرویو کی تیاری کر رہا تھا۔

دلفنا حسین اٹھی اور بیڑھیوں کی طرف بڑھ گئی۔ مٹھی میں خشک میوے بھرے وہ ان کو وقفے وقفے سے کھاتی زینے چڑھتی اوپر آئی۔ اپنے کمرے کا دروازہ کھولا اور پھر.....

اس کی لُخراش چیخ سب نے سنی تھی۔ زمر اور سعدی کے خیالات ٹوٹے جیسے ان کو ہوش آیا۔ وہ دونوں اوپر کی طرف بھاگے۔

”حسین کیا...“ چوکھٹ تک آتے ہوئے سعدی کے الفاظ ٹوٹ گئے۔ کمرے کی حالت بتا رہی تھی کہ کیا ہوا تھا۔

ہر شے بکھری ہوئی تھی۔ الماریاں دروازے کھلے پڑے تھے۔ جوتوں والے خانے سے سارے ڈبے نکلے ہوئے تھے۔ لاک والی دراز میں چابی لگی تھی اور وہ کھلا تھا۔ حسین حواس باختہ سی کھڑکی میں کھڑی تھی۔ شل۔ ہکا بکا۔ کھڑکی بھی پوری کھلی تھی۔

”حہ تم ٹھیک ہو؟ کیا ہوا؟“ زمر نے بے اختیار اسے کندھوں سے تھاما اور اس کا چہرہ اپنی طرف گھمایا۔

”وہ میرے سامنے کھڑکی سے کودا... اور...“ وہ شل سی ابھی تک گردن موڑے باہر دیکھ رہی تھی۔ ”اور اس نے دیوار پھاند لی۔“

”کون؟ کون تھا؟“ سعدی تیزی سے بالکونی میں بھاگا تھا۔

”وہ ایک آدمی تھا اس نے سرخ مفلر لپسٹد کھا تھا اور... اور اس کے لمبے بال تھے... اور چھوٹا سا قد تھا۔“ وہ سفید چہرے کے ساتھ

ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں بتانے لگی۔ سعدی واپس اندر آیا اور سیڑھیوں کی طرف لپکا۔ اسے نیچے جا کر اس آدمی کو پکڑنا تھا۔

”کیا کر رہا تھا وہ یہاں؟ ہتاؤ حسین؟“

”اس کے ہاتھ میں میرا میموری کارڈ تھا۔ وہ علیشا والا میموری کارڈ لے کر چلا گیا۔ اللہ میرے!“ حسین نے سر دونوں ہاتھوں میں تھام

لیا۔ زمر نے بے ساختہ کھلی دراز کو دیکھا۔ اسے زور کا چکر آیا تھا۔

”میرے پاس تو اسکی کاپی بھی نہیں ہے زمر۔ اب کیا ہوگا؟“

زمر غصہ حال سی کاؤچ پہ گری گئی۔ اب کیا ہوگا؟

قصر کاردار کے برآمدے کے اونچے ستونوں پہ دھوپ کی پہلی کرنیں گرتی نظر آرہی تھیں۔ ہاشم موہائل دیکھتا زینے اترتا نیچے آ رہا تھا۔

اس کی کار سامنے منتظری کھڑی تھی۔ شوفر دروازہ کھولے ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ وہ جیسے ہی کار کے قریب آیا ایک گارڈ سامنے سے تیز تیز چلتا

اس طرف آتا دکھائی دیا۔

”سر!“ اس نے عجلت میں پکارا۔ ہاشم نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔

”کیا ہے؟“

”ایک ملاقاتی ہے آپ کے لئے۔ ان کا کہنا ہے کہ آپ ان سے واقف ہیں، سوان سے مل لیں؟“

”اسی وقت؟“ اس نے نخوت سے ابرو اٹھائی مگر پھر وہ ٹھہر گیا۔ گارڈ کے پیچھے آتے ذی نفس کو وہ پہچان گیا تھا۔ پاسپورٹ، انجان کائر

بہت سی کڑیاں ایک ساتھ ذہن میں ملی تھیں۔

”ہیلو مسٹر کاردار!“ وہ قدم قدم چلتی ان کے سامنے آکھڑی ہوئی اور اپنے ہیروں کی انگوٹھیوں سے مزین ہاتھ سے کان کے پیچھے بال

اڑتی نرمی سے بولی۔ ”میں یہ جانے بغیر کہ کس کے لئے کام کر رہی ہوں آپ کے لئے بہت کچھ کر چکی ہوں پہلے۔ اب بھی فارس غازی

کے خلاف آپ کی مدد کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

”آپ کی تعریف؟“ وہ انجان بن کر بولا البتہ چہرے کی تمام بے زاری اور کلفت غائب ہو چکی تھی۔ مسکرا کر دلچسپی سے وہ اس نوار کو

دیکھ رہا تھا۔

”مجھے ڈاکٹر ایمن کہتے ہیں۔ فارس غازی نے میرا ہسپتال جلایا تھا اس نے مجھے تباہ کر دیا۔ تو کیوں نا ہم مل کر اس سے بدلہ لیں؟“

ہاشم کی مسکراہٹ گہری ہوئی۔ ”تو وہ آپ تھیں۔ سعدی یوسف کا پاسپورٹ چرا نے والی۔ اور مہینا پاسپورٹ کے علاوہ بھی بہت کچھ ہوگا آپ کے پاس۔“ مسکرا کر اثبات میں سر ہلاتا وہ کہہ رہا تھا۔
”وہ آپ تھیں! جی!“

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

